جلد ۶ عدد ۲
صفر المظفر سنہ ۱۳۵۴ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ (۱۲۰)
رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

۶۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

ایکہزار روپیہ نقد کے انعامات میں مدت کی توسیع

ایک انعام سو روپیہ دو انعام ۵۰ روپیہ - چار انعام ۲۵ روپیہ آٹھ انعام ۲۰ روپیہ سولہ انعام ۱۰ روپیہ اور ۲۷ انعام پانچ پانچ روپیہ کے اس طرح جملہ ایک ہزار روپیہ کے ایک سو تین انعامات الاعظم کے ان خریداروں میں تقسیم ہوں گے جو یکم شہریور ۱۳۴۴ف م آخر جون ۱۹۳۵ء سے پہلے ایک سال کے لیے خریدار بن کر چھ روپیہ روانہ کردیں گے انعامات کی تقسیم قرعہ اندازی سے ہوگی اور ایکہزار خریداران کی تکمیل ضروری ہے جس کے لیے مدت میں توسیع کی گئی ہے اگر اب بھی تکمیل تعداد نہ ہوگی تو اسی تناسب سے انعامات کی رقم کم کردی جائے گی۔ بہر حال ہر دس خریدار میں ایک کو انعام ملنا ضروری ہے۔ آپ کے روانہ کردہ چھ روپیہ میں انعامات کے علاوہ سال بھر تک ہفتہ وار الاعظم اور ماہانہ الاعظم آپ کو ملے گا ہفتہ وار اخبار بڑے سائز کے (۲۰) صفحہ پر اور ماہانہ (۶۸) صفحہ پر شائع ہوتا ہے ہفتہ وار میں مملکت آصفیہ کے چپہ چپہ کی خبریں حیدرآباد' عالم اسلام اور ممالک غیر کی تمام اہم خبریں افسانے نظمیں اور تمام وہ دلچسپیاں ہوتی ہیں جو آپ کو دکن کے کسی اخبار میں نہیں مل سکتیں اسی طرح ماہانہ الاعظم آپ کو ملک کے تمام ادبی رسائل سے بے نیاز کردے گا جس میں ملک و بیرون ملک کے مشہور اہل علم و قلم اصحاب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ بہر حال بہ حیثیت مجموعی صرف چھ روپیہ سالانہ میں آپ کو ایک سال تک ہفتہ وار اخبار۔ ماہانہ ادبی رسالہ کیساتھ ملے گا۔ گراں قدر انعامات بھی حاصل ہوسکتے ہیں۔ پس دیر نہ کیجیے اور پہلی فرصت میں چھ روپیہ منی آرڈر سے روانہ کردیجیے یا پہلے ایک کارڈ لکھکر اخبار و رسالہ کا نمونہ مفت طلب فرماکر دیکھ لیجیے

مینیجر الاعظم ثریا بلڈنگ پتھر گٹی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

بابتہ ماہ صفر۔ جلد (۶) عدد (۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِشارات

مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے وہاں ایک بڑا اور خطرناک فتنہ تکفیر و تفسیق اور لعن کا بھی ہے۔ لوگوں نے اسلام کے سیدھے سادھے عقائد میں موشگافیاں کیں اور قیاس و تاویل سے ان کے اندر بہت سے ایسے فروع اور جزئیات پیدا کر لیے جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے، اور جن کی کوئی تصریح کتاب و سنت میں نہ تھی، یا اگر تھی بھی تو اللہ اور اُس کے رسول نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ پھر انھوں نے (اللہ انہیں معاف فرمائے) اپنے وضع کردہ فرعی مسائل کے ساتھ اتنا اہتمام کیا کہ انہی پر ایمان کا مدار ٹھیرا دیا، اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بیسیوں فرقے بنا دیے، اور ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا، حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین میں ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیا تھا اور کسی کو یہ حق نہ دیا تھا کہ اپنے اختیار سے کسی چیز کو کفر اور کسی چیز کو اسلام ٹھیرا لے۔ اس فتنے کی محرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی، حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ، بہر حال اس نے جمعیت اسلامی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا!

کسی مومن کو جو خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے ایمانیات پر اعتقاد رکھتا ہو، کافر کہدینا درحقیقت ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ جسارت بندوں کے مقابلے میں نہیں، خدا کے مقابلہ میں ہے۔ یہ خدا سے معارضہ ہے کہ جس کے حق میں خدا ایمان کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے حق میں ایک بندۂ خدا کفر کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی کے ساتھ تکفیر و تفسیق سے منع فرمایا ہے، اور یہاں تک فرما دیا ہے کہ جو شخص کسی کو کافر کہے گا درانحالیکہ وہ حقیقت میں کافر نہ ہو تو ور کفر کا فتوی خود تکفیر کرنے والے کی طرف پلٹ آئے گا۔

ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہا احدھما (بخاری)۔	جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہے گا تو یہ قول دونوں میں سے کسی ایک پر ضرور پڑے گا۔
لا یرمی رجل رجلا بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذلک (بخاری)۔	جب کبھی ایک شخص دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت لگائے گا تو وہ تہمت اسی پر پلٹ آئے گی اگر وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے درحقیقت کافر یا فاسق نہ ہو۔
من دعا رجلا بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذالک الا حار علیہ (مسلم)۔	جس شخص نے کسی کو کافر یا دشمن خدا کہا درانحالیکہ وہ شخص ایسا نہ تھا، تو یہ قول خود قائل پر ضرور پلٹ جائیگا
من لعن مومنا فھو کقتلہ ومن قذف مومنا بکفر فھو کقتلہ (بخاری)۔	جس نے کسی مومن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کر دیا اور جس نے کسی مومن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے گویا اسے قتل کر دیا

قطع نظر اس کے، مسلمانوں کی تکفیر و تفسیق ایک سنگین قومی جرم بھی ہے۔ جو شخص کسی ایک مسلمان یا مسلمانوں کے کسی گروہ پر ناحق کفر کا فتوی لگاتا ہے وہ صرف اسی شخص یا گروہ کے حق میں ظلم نہیں کرتا بلکہ

پوری اسلامی جمعیت پر ظلم کرتا ہے، اور خود اسلام کو ضرر عظیم پہونچاتا ہے۔ اس کی وجہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے

اسلامی جمعیت اور جاہلی جمعیتوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ جاہلی جمعیتیں رنگ، نسل، زبان، اور وطن کے رشتوں پر قائم ہوئی ہیں، اور اسلامی جمعیت کا قیام صرف دین کے رشتہ سے ہے۔ جاہلی جمعیتوں میں عقائد و افکار کے اختلاف سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا، اس لیے کہ خیالات اور اعتقادات کا اختلاف ان کے افراد کو اس رشتے سے خارج نہیں کرتا جو نسل یا وطن یا زبان یا رنگ کی وحدت سے قائم ہوتا ہے۔ باطن میں خواہ زمین و آسمان کا تفاوت ہو جائے لیکن خون کا تعلق منقطع نہیں ہوسکتا، نہ وطن کا رشتہ کٹ سکتا ہے، نہ زبان کا رابطہ منفک ہوسکتا ہے، نہ رنگ کی وحدت میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اس لیے اختلاف عقائد سے جاہلی جمعیتوں کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ لیکن اسلام جو چیز مختلف النسل، مختلف اللون، مختلف اللسان اور مختلف الاوطان افراد کو جوڑ کر ایک قوم بناتی ہے، وہ عقیدہ کی وحدت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں عقیدہ ہی سب کچھ ہے، نسل رنگ زبان وطن کچھ بھی نہیں۔ لہذا جو شخص دین و اعتقاد کے رشتہ کو کاٹتا ہے وہ دراصل اللہ کی اس رسی پر قینچی چلاتا ہے جس نے ایک خدا کی پرستش کرنے والوں، ایک رسول کے ماننے والوں اور ایک کتاب پر ایمان لانے والوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا ہے۔ اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو کافر کہہ دینے کے معنی صرف یہی نہیں کہ اس کے اعتقاد اور نیت پر حملہ کیا گیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی جمعیت اور اس کے ایک فرد یا چند افراد کے درمیان برادری، محبت، معاشرت، معاملت، اور تعاون باہمی کے سارے رشتے کاٹ دیے گئے، اور امت مسلمہ کے جسم سے اس کے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو چھانٹ کر پھینک دیا گیا۔

یہ فعل اگر حکم خدا و رسول کے مطابق ہو تو یقیناً حق ہے، اور سڑے ہوئے عضو کو کاٹ کر پھینک دینا ہی اسلام کے ساتھ سچی خیرخواہی ہے لیکن اگر عضو حقیقت میں سڑا ہوا نہ ہو، اور محض ظلماً اس کو کاٹ ڈالا جائے تو یہ ظلم خود اس عضو سے بڑھ کر اس جسم پر ہوگا جس سے وہ کاٹا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے رشتۂ دینی کے احترام کی سخت تاکید فرمائی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴ : ۱۳)۔ جو شخص (اظہار اسلام کے لیے) تم کو سلام کرے اس کو نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک سریہ میں ایک شخص نے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا السلام علیکم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مگر ایک مسلمان نے یہ گمان کر کے کہ اس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے اسے قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو حضور اس پر سخت ناراض ہوئے اور اس مسلمان سے باز پرس کی۔ اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص نے محض ہماری تلوار سے بچنے کے لیے کلمہ پڑھ دیا تھا اس پر سرکار نے فرمایا ھلا شققت عن قلبہ۔ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟

ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر ایک شخص مجھ پر حملہ کر کے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے، اور جب میں حملہ کروں تو وہ کلمہ پڑھ لے۔ کیا ایسی حالت میں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ حضور نے فرمایا نہیں۔ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ دیا۔ آپ نے فرمایا باوجود اس کے تم اس کو نہیں مار سکتے۔ اگر تم نے اس کو مارا تو وہ اس مرتبے میں ہوگا جس میں تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم اس مرتبے میں ہو جاؤ گے جس میں وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا اگر کوئی شخص کسی کافر پر نیزہ تانے اور جب سنان اس کے حلق تک پہنچ جائے اس وقت وہ لا الٰہ الا اللہ کہدے، تو مسلمان کو لازم ہے کہ فوراً اپنے نیزہ کو واپس کھینچ لے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور مسلمان سے لڑنا کفر۔

یہ سب کچھ اس لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور جمعیت کا قیام، رابطہ دینی کے سوا کسی دوسری چیز سے نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں میں اس رابطہ کا احترام نہ ہو، اور وہ بات بات پر اس کو کاٹنے لگیں تو امت کا سارا شیرازہ بکھر کر رہ جائے۔ اور اس قوم کی کوئی اجتماعی قوت باقی ہی نہ رہے جو باطل پرستوں کے مقابلے میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور خیر و تقویٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ہمارا یہ منشا نہیں کہ تکفیر و تفسیق سے مطلقاً پرہیز کیا جائے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص صریح کفریات بکنے اور لکھنے لگے، تب بھی اس کو مسلمان کہا اور سمجھا جاتا رہے۔ یہ منشا نہ کتاب و سنت کی مندرجہ بالا نصوص کا ہے نہ ہماری تقریر گذشتہ کا۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اس لیے کہ کسی مسلمان کو اسلام سے خارج کر کے جس قدر نقصان دہ ہے کسی کافر کو اسلامی جمعیت میں شامل کرنا بھی اس سے کچھ کم نقصان دہ نہیں۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مسلمان کی تکفیر کے معاملہ میں انتہا درجہ کی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے، اتنی ہی احتیاط جتنی ایک شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ ہر شخص جو مسلمان اور لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہے اس کے حق میں یہی گمان ہونا چاہیے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کرتا ہے جس میں کفر کا شائبہ پایا جاتا ہو، تو اس کے حق میں یہ امید رکھنی چاہیے کہ اس نے کفر کے ارادہ سے ایسی بات نہ کی ہوگی، بلکہ محض جہل اور ناسمجھی سے کی ہوگی۔ اس لیے بوہلہ اول اس پر کفر کا حکم لگانے کے بجائے قول جمیل سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے اور اپنی بات پر اصرار کرے، تو اس بات کو جس پر وہ اصرار کر رہا ہے کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ کفر و ایمان کے درمیان فرق کرنے والی صریح نصوص کے خلاف ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے زیر بحث قول یا فعل میں کسی تاویل کی گنجایش ہے یا نہیں؟ اگر صریح نصوص کے خلاف نہ ہو اور تاویل کی گنجایش ہو تو کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا زیادہ سے زیادہ ایسے شخص کو گمراہ کہا جا سکتا ہے، اور وہ بھی اس خاص مسئلہ میں، نہ کہ بالکلیہ۔ البتہ اگر

اس کا اعتقاد نص صریح کے خلاف ہو، اور وہ شخص یہ معلوم کرنے کے بعد بھی کہ اس کا اعتقاد کتاب اللہ کی تعلیم کے خلاف ہے اپنی بات پر قائم رہے، اور اس کے قول کی کوئی ایسی تاویل کی ہی نہ جا سکتی ہو جس سے کسی طور پر اس کو کتاب اللہ کے مطابق کیا جا سکتا ہو، تو ایسی صورت میں مسئلہ کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے فسق یا کفر کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مدارج و مراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تمام جرم اور تمام مجرم یکساں نہیں ہیں۔ ان میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے اور انصاف کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھ کر سزا تجویز کی جائے۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا یقیناً بے انصافی ہے۔

کفر و اسلام کا ایک پہلو باطنی ہے اور ایک ظاہری۔ باطن کا تعلق انسان کے دل اور اس کی نیت سے ہے، اور ظاہر کا تعلق اس کی زبان اور عمل سے ہم ایک حد تک آدمی کے قول و فعل سے بھی اس کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں اگر یہ محض قیاس و گمان ہوگا، علم اور یقین نہ ہوگا، اور علم و یقین کے بغیر صرف قیاس و گمان کی بنا پر کسی کے ایمان یا کفر کا فیصلہ کرنا، یقیناً ظلم ہے، اگرچہ ایسا فیصلہ نفس الامر کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا حق یہی ہے کہ ایمان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ کس کے دل میں ایمان ہے اور کس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (۵۳ : ۲)۔ ہماری نظر صرف ظاہر تک جا سکتی ہے، اور صرف ظاہری اقوال و افعال ہی کو دیکھ کر ہم رائے قائم کر سکتے ہیں کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں ہو سکتا ہے کہ جو شخص ظاہر میں جہالت و نادانی سے کفریات بک رہا ہے وہ باطن میں سچا اور پکا مومن ہو اور اس کے دل میں خدا اور رسول کی محبت بہت سے واعظوں اور مرشدوں سے بڑھ کر ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص زور شور کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان کرتا ہے، اور احکام شریعت کی پابندی میں اہتمام بھی کرتا ہے، وہ محض ایک ریاکار منافق ہو۔ لہٰذا ظاہر کی بنا پر کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ

کرتے ہوئے، انسان کو خدا کی پکڑ سے بہت ڈرنا چاہیے، اور ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ کیسی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے، اور کیا ایسے معقول وجوہ موجود ہیں جن کی بنا پر اس ذمہ داری سے بچنے کی بہ نسبت اس کا اٹھا لینا زیادہ بہتر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانوں کی طبائع، استعدادات، اور عقلی صلاحیتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگ نہایت سادہ لوح ہوتے ہیں، ایک سیدھی سادی بات کو اجمالی طور پر مان لیتے ہیں، تفصیلات اور باریکیوں کو سمجھنے کی نہ ان میں قابلیت ہوتی ہے، نہ وہ ان کے طالب ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے بعض لوگوں میں غور و فکر کا مادہ ہوتا ہے۔ اجمال سے ان کی تشفی نہیں ہوتی۔ تفصیلات ڈھونڈتے ہیں، اور نہیں ملتیں تو پیدا کرتے ہیں۔ پھر غور و فکر کرنے والوں کے رجحانات اور مدارجِ عقلی بھی بے شمار ہیں۔ کسی کا میلان شک کی طرف ہوتا ہے، اور کسی کا یقین کی طرف۔ کوئی مادیات و محسوسات پر فریفتہ ہوتا ہے، اور کوئی معقولات پر۔ کوئی بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے، اور کوئی پیچ کی راہوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ کوئی حقیقت پسند (Realist) ہوتا ہے، اور کسی کو وہم و خیال کی وادیوں میں گھومنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ غرض نظر و فکر کے بے شمار راستے ہیں جن کو انسانی اذہان اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق اختیار کرتے ہیں، اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی انسان کی طبعی افتاد اور فطری رجحان اور عقلی استعداد کو بدل دے۔

جس خدا نے اسلام کو تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیئے نازل کیا ہے اس سے بڑھ کر انسانی فطرت کے ان اختلافات کو جاننے والا، اور ان کی رعایت ملحوظ رکھنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے اپنے پسندیدہ دین کی بنیاد ایسے سادہ اور مجمل عقائد پر رکھی ہے جنھیں ایک کم عقل

دہقان سے لے کر ایک نکتہ سنج فلسفی اور ایک حقیقت طلب طبیعی تک سب قبول کر سکتے ہیں۔ ان عقائد کی سادگی اور ان کا اجمال ہی وہ چیز ہے جس نے ان کو ایک عالمگیر انسانی مذہب کے لیے بنیادی اصول بننے کے قابل بنایا ہے۔ جو شخص غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے لیے صرف اتنا مان لینا ہی کافی ہے کہ خدا ایک ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، قرآن اس کی کتاب ہے، اور قیامت کے روز ہمیں اس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور جو شخص فکر و تدبیر کی قوت رکھتا ہے اس کے لیے اس اجمال میں اتنی وسعتیں ہیں کہ وہ اپنی استعداد عقلی اور اپنے رجحان طبع کے مطابق جستجوئے حقیقت کے لیے جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اور جتنی دور چاہے جا سکتا ہے۔

وہ خواہ کوئی راہ اختیار کرے، اور کتنی ہی دور تک چلا جائے، جب تک وہ ان حدود کے اندر مقید ہے جو کلام اللہ نے اسلام اور کفر کے درمیان کھینچ دی ہیں، اس وقت تک وہ دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایمان باللہ کے مسئلہ میں ملاک امر صرف یہ ہے کہ کائنات کا بنانے اور چلانے والا ایک خدا ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس بات کو ایک سیدھا سادہ کسان جس طور پر مان سکتا ہے، ممکن نہیں کہ ایک غور و فکر کرنے والا آدمی اسی طرح مان لے۔ پھر ایک خاص طرح کا رجحان طبع رکھنے والا آدمی اس میں تدبر کرکے خدا کی ہستی اور اس کی صفات اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کی کیفیت کے متعلق جو تفصیلی تصورات اپنے ذہن میں جمائیگا، ممکن نہیں کہ ان امور کے متعلق ایک دوسری طرح کا رجحان رکھنے والے آدمی کے تصورات بالکل اس کے مطابق ہوں۔ لیکن جب تک یہ سب اس بنیادی عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں، سب کے سب مسلمان ہیں، خواہ تفصیلات میں ان کے تفکرات حقیقت نفس الامری تک پہنچنے میں کتنے ہی ناکام ہوئے ہوں۔ اسی طرح وحی، رسالت، ملائکہ اور یوم آخر کے متعلق بھی اسلامی عقائد میں چند اصولی ہیں جن کو دین کی ضروریات (Essentials) کہنا چاہیے، اور باقی

تفصیلات ہیں جن میں سے بعض کے لیے انسان کو کلام اللہ میں صریح یا قابل تاویل اشارات مل جاتے ہیں اور بعض کو انسان خود اپنے رجحان طبع کے مطابق اپنے ذہن سے پیدا کر لیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر تفصیلات کا حکم لگانے میں انسان کی عقل غلطی کرے، اور اس کے تصورات حقیقت سے بہت دور جا پڑیں، لیکن جب تک وہ ان عقائد میں ملاک امر کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا عقل و فکر کی کوئی گمراہی اس کو دائرۂ دین سے خارج نہیں کر سکتی، چاہے مرکز دین سے اس کو کتنا ہی بعد ہو جائے۔

اسلام میں فرقوں کی پیداوار کا اصل سبب یہی ہے کہ کلام اللہ میں اصول و ضروریات دین کے متعلق جو مجمل اور بسیط تصورات پیش کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں ان کی تفصیل میں جو لطیف اشارات کر دیے گئے ہیں، ان کو سمجھنے میں مختلف لوگوں نے اپنی عقلی استعدادات اور طبعی رجحانات کی بنا پر قیاس واستدلال کے ذریعہ سے جزئیات اخذ کر لیے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس حد تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اور اس میں بھی کوئی خرابی نہ تھی کہ ایک گروہ صرف اپنے مسلک کو حق سمجھتا اور دوسرے گروہوں سے بحث کر کے ان کو اپنے مسلک کی طرف لانے کی کوشش کرتا لیکن غضب یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے قیاسی و تاویلی عقائد کو بھی اصول و ضروریات دین میں شامل کر لیا، اور اس بنا پر ہر ایک جماعت نے ان تمام جماعتوں کی تکفیر کی جو ان عقائد کو نہ مانتی تھیں۔ یہیں سے حرب عقائد کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی ظلم کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عقائد اسلام میں قیاسات و تاویلات سے جو راہیں اختیار کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی راہیں غلط ہیں لیکن ہر غلطی حتماً اور لازماً کفر تو نہیں ہے۔ غلطی کو غلطی کہنا، اور اس کا ارتکاب کرنے والے کو گمراہ اور غلط کار سمجھنا اور اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا بلا شبہ جائز ہے۔ لیکن جب تک کوئی شخص اس نفس حقیقت کا

انکار نہیں کرتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اس کو کافر کہنا کسی طرح بھی جائز نہیں، خواہ اس کی گمراہی کتنی ہی بڑھ گئی ہو۔

افسوس ہے کہ علماء متاخرین نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول سمجھنے لگے ہیں جن کو انہوں نے اپنی مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو انہوں نے نصوص سے معانی اخذ کرنے میں اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔

اس بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا، مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافر گری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے، بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جس کی نمایندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دور بھاگنے لگے ہیں۔ اور عام طور پر مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں آپس کی لڑائیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں عام مسلمانوں کو مذہبی علوم کی واقفیت بہم پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا، سو یہ اس کافر گری کے صدقہ میں ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں مذہب سے ناواقفیت اور گمراہی کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کاش ہمارے علماء اپنی اس غلطی کو محسوس کریں اور اسلام اور مسلمانوں پر نہیں تو خود اپنے اوپر ہی رحم کر کے اس روش سے باز آجائیں جس نے ان کو اپنی قوم میں اس قدر رسوا کر دیا ہے، درانحالیکہ یہی وہ قوم تھی جو کبھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔

مقالات

انسانیت کے چند مختلف پہلو

از جناب مولانا مناظر احسن گیلانی

"مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ سیرۃ مطہرہ نبویہ پر ایک مفصل کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام "نبوت بینہ" ہوگا۔ اس کتاب کے مختلف ابواب جداگانہ عنوانات کے تحت "ترجمان القرآن" میں شائع ہوتے رہیں گے۔ ذیل کا مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے"

تجزیہ (۱) انسانیت کے ظہور کا صحیح مقام آدمی کا ظاہر ہے یا باطن؟ (۲) آدمی کی بڑائی کا مدار اس کے معنوی کمالات پر ہوتا ہے یا بیرونی خصوصیات پر؟ (۳) اس کی قدر و قیمت اندر سے لگائی جاتی ہے یا باہر سے (۴) باہم انسانوں کے مختلف افراد میں ترجیح و برتری اندر کی راہ سے پیدا کی جاتی ہے یا باہر سے؟ (۵) اقوام اور امتوں کی صحیح تقسیم وہ ہے، جو ظاہری اوصاف اضافی اور فرضی انتسابات کی بنیاد پر کی جاتی ہے، یا وہ جو ذہنی اور معنوی اندرونی و باطنی وجوہ پر مبنی ہے

انسان کی جلالت و کرامت اگر باطنی خصوصیات، اور معنوی کمالات سے قطع نظر کر لیا جائے تو آدمی کے اس جرم استخوانی، ڈھیلے ڈھالے، کھوکھلے قالب پر کیا انسانیت کی اس عظمت و جبروت کرامت و جلالت کا مینار کھڑا کیا جا سکتا ہے جس کا ہنگامہ اتنی بلند آہنگوں کے ساتھ مذہبی اور لامذہبی دونوں حلقوں میں پوری قوت کے ساتھ برپا ہے؟ مذہب نے اگر خدا کو سب سے بڑا اور اکبر مانا ہے تو خدا کی پھونکی ہوئی روح کے مظہر انسان کو خلافت کا مقام عطا کر کے کیا سارے جہان پر اس کی کبریائی کا

اعلان نہیں کیا؟ اور آسمانی نوشتوں میں جب حریم عفاف ملکوت کے قدوسیوں کی پیشانیاں اس کے آگے جھکی ہوئی بتائی گئی ہیں تو طبقات وجود کی کونسی ہستی رہ جاتی ہے جو انسانی حقیقت کے سامنے خمیدہ نہ رہی؟ مشاہدہ کی کون تکذیب کرسکتا ہے؟ ہستی کے اس سمندر کی کونسی موج ہے جس کے گلے میں آدم کے بچوں کی اطاعت کا طوق نہیں پڑا ہوا ہے؟ ان جمادوں، نباتوں، چرندوں پرندوں، اور درندوں میں کون ہے جس پر اس کے تسخیری فرامین مسلسل تعمیل نہیں ہو رہے ہیں؟ خاک کا یہ تودہ زمین ہو، یا پانی کا وہ ذخیرہ جسے تم سمندر کہتے ہو، کیا اس کے قابو سے باہر ہیں؟ ہوا پر اس کے قبضہ کی داستان سنائی گئی تھی، تو تقلیدی شکوک نے تم کو مذبذب رکھا تھا لیکن کیا اب بھی اس کو جھٹلاؤ گے جسے تمہاری آنکھیں دیکھ رہی ہیں؟ سچ کہا جس نے کہا کہ آنکھوں کو وہ سب کچھ نگلنا پڑے گا جسے کانوں نے اگلا تھا۔ اور یوں بھی تو جن کی خودی کے تنگ و تاریک شکنجہ میں، خدا کی بڑائی بلکہ خدا ہی کی گنجایش نہیں ہے، کم از کم انسان کی بڑائی کے اعتراف پر تو وہ بھی مجبور ہیں وہ جو اوپر سے نیچے نہ آسکے، کیا نیچے سے اوپر چڑھتے ہوئے بالآخر اپنے ارتقائی عروج کی انتہائی بلندی پر اس کو کھڑا نہیں پاتے ہیں، جس کو مذہب نے بھی خدا کی تقویمی حسن کاریوں کا آخری عمل ٹھیرایا ہے۔ لیکن اندر سے نکل کر جو انسان کے صرف بیرونی ڈھانچے پر ٹوٹے گا، اس کو کونسی ایسی انوکھی چیز ہاتھ آئے گی جس پر انسانیت کی متفقہ جلالت و برتری کا طرّہ امتیاز صحیح معنوں میں نصب کیا جاسکتا ہے۔ آدمی کے باہر میں کیا ہے جس میں دوسرے اس کے ساجھی اور سہیم نہیں؟ ہاں اس کی قامت دراز ہے اس کا قد اونچا ہے لیکن کیا بلوط سے اونچا؟ اور ساگوان سے زیادہ بلند؟ اور سٹ سے زیادہ بالا؟ فربہ جثوں، اور گدرائے ہوئے شہروں کی آدمیوں میں کمی نہیں، لیکن کیا پروار کے بیلوں سے زیادہ فربہی گجرات کی بھینسوں سے زیادہ موٹائی؟ آسام کے ہاتھیوں سے زیادہ پہنائی؟ بشر کے بشروں پر جو کچھ نظر آتا ہے کن کے چہرے اس سے خالی ہیں، کتنی پیشانیوں پر دو آنکھیں نہیں، کس کے مکھڑے پر ناک نہیں، کیا آدمی

ہی کے منہ میں دانت ہیں۔ اسی کے کاسۂ سر پر کان مڑھے گئے ہیں؟ اوپر سے لے کر نیچے تک جسد انسانی کا جائزہ لو، ٹٹولتے جاؤ، تمہاری گرفت میں کیا آئے گا۔ جو دوسروں کے پاس نہیں؟ اور اسی لیے کہا گیا اور اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی ساری عظمتوں، ساری بزرگیوں، تمام بڑائیوں کے قصر معلی کی زیادہ تر بنیاد ان نادیدہ اور غیر مرئی صفات پر قائم ہے، جو آدمی کے ظاہر میں نہیں بلکہ داخل میں ہیں، باہر میں نہیں بلکہ اندر میں اور قالب میں نہیں بلکہ قلب میں ہیں۔

انسان کی قدر و قیمت کیا آدمی کی قدر و قیمت کے تفاوت کا منشا بھی عموماً بیرونی امتیازات نہیں، بلکہ اندرونی کمالات و حسنات ہی نہیں ہوتے؟ وہ جو ہم میں چپراسیوں کی صف میں جوتوں کے کے پاس دو ٹانگوں پر کھڑا کیا گیا ہے اور ہر قسم کی ذلت و خواری کے ساتھ کھڑا کیا گیا ہے، آخر اس کے باہر میں کیا نہیں ہے جو ان میں ہے جنہیں بصد اعزاز و بہ ہزار احترام، صدارت کی کرسیاں اور وزارت کے قلمدان سپرد کیے گئے؟

مختلف افراد کی باہمی ترجیح و مزیت اور یہ جامعات و کلیات، مدارس، اور اسکولوں، امتحانوں اور درجوں، ڈویژنوں، اور اعزازی سندوں ڈگریوں، اور تمغوں، بھانت بھانت کے گونوں اور قباؤں عباؤں، اور جبوں، یہ کس چیز کا مظاہرہ ہو رہا ہے؟ کیا اس کا جو کچھ آدمی کے اوپر ہے؟

کیا سوالات کے پرچوں سے جواب دینے والوں کے رنگ و روپ کا سراغ لگا سکتے ہیں؟ جوابی بیاضوں سے کیا واقعی لکھنے والوں کے چہروں کی تقطیع اور آنکھوں کی ساخت کا پتہ چل سکتا ہے، یا پتہ چلانے کا کام لیا جا سکتا ہے؟ یقیناً کروڑوں روپے کے ان مصارف کا مقصد یہی اور صرف یہی ہے کہ جانچے جائیں آدمی کے وہ باطنی کمالات، قدرتی ملکات معنوی حسنات جن کی بنیاد پر نوع انسانی کا ایک فرد دوسرے سے زیادہ قیمت، زیادہ عزت کا واقعی طور پر مستحق قرار پاتا ہے۔

الغرض بڑائی ہو، یا عظمت، قدر ہو، یا قیمت، ترجیح ہو، یا مزیت، انسانی فطرت کے ان

مرحلوں کی بنیاد، اگر سب نہیں تو، زیادہ تر باہر میں نہیں، اندر میں ہے، خارج میں نہیں، داخل میں ہے، ظاہر میں نہیں، باطن میں ہے، پوست میں نہیں مغز میں ہے، اور کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ جسم میں نہیں روح میں ہے، جسد میں نہیں جان میں ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں آکر طے ہو جاتا ہے کہ انسانیت ہو یا آدمیت کوئی بیرونی نہیں بلکہ اندرونی، ظاہری نہیں بلکہ باطنی، خارجی نہیں بلکہ داخلی لفظی نہیں، بلکہ ایک معنوی حقیقت ہے، اور شائد کہ وہ صرف معنوی ہی حقیقت ہے۔

دنیا نے ہمیشہ یہی سمجھا، اور ہمیشہ یہی سمجھتی رہے گی " آدمی کبھی نہ ناپا گیا ہے، نہ شائد آیندہ وہ ناپا جائے، وہ صحرائی بانس نہیں ہے جس کی پیمایش کی جائے، اور نہ چراگاہوں کا چرندہ ہے جس کی قیمت کا اندازہ گوشت اور چربی سے ترازو کے پلڑوں پر کیا جاتا ہے، نہ چکلہ کر بنی آدم کے دام لگائے گئے نہ سونگھ کر اس کی فردوری ٹھیرائی گئی۔

قسمت کے وقت انسان کی قسمت یہی واقعہ تھا اور اب تک ہے، سب یہی کہتے آئے اور کہہ رہے ہیں، کہتے چلے جائیں گے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟ مگر ہوا کہ ٹھیک وہی آدمی جس کو زبانوں نے یکزبان ہو کر صرف معنوی حقیقت اور باطنی وجود قرار دیا تھا، جوں ہی کہ اس کی عظمت وجلالت کا نہیں برجیح موزیت کا نہیں بلکہ قسمت، اور صرف بانٹنے کا وقت آیا تو بخت کی خرابی اور نصیبہ کی بیادی تو دیکھو! کہ جو اندر تھے دفعۃً باہر نکل آئے، وہ جو باطن میں اور صرف باطن میں غرق تھے اچانک سطح ظاہر پر آکر ہاتھ پاوں ٹیکنے لگے۔ ضغطہ! اور کیسا شدید ضغطہ!! کہ الٹ گیا، انسان بالکل الٹ گیا داخل خارج ہو گیا، اندر باہر ٹھیرایا گیا، جو معنی تھا لفظ قرار دیا گیا، مغز کو چھلکا، اور صرف چھلکا سمجھا گیا، آدمی سے آدمی کا فطری مقام چھوٹ گیا پھر وہ بھٹکا اور ایسا بھٹکا کہ اس کا بھٹکنا کسی طرح ختم نہیں ہو رہا ہے، وہ لڑھکا اور اس بری طرح لڑھکا کہ اس کی قلابازیاں جاری ہیں اور اسی شدت کیساتھ مسلسل جاری ہیں مغالطے ہیں اور غلط فہمیاں، اوہام ہیں اور مفروضات، جن کی خندقوں میں

گر رہی ہے، آدم کی اولاد گر رہی ہے، کوئی نہیں جو ہاویہ کے اس عذاب سے اس کو باہر کھینچے یا کم از کم جو نہیں گرے ہیں ان ہی کے بازو کو بڑھ کر تھامے۔ دیکھتے ہیں، اور نہیں دیکھتے، سنتے ہیں، اور نہیں سنتے، سمجھتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ دیکھ رہے تھے جب تک کہ آدمی کی عظمت کا سوال تھا، سن رہے تھے جب تک اس کی قدر وقیمت کی بحث تھی، سمجھ رہے تھے جبتک اس کی ترجیح و برتری کی تلاش تھی، لیکن جوں ہی کہ بجائے عظمت وقیمت کے آدمی کی قسمت کا سوال اٹھا سب اندھے بنے سب بہرے ہوئے۔ کوئی ہے جو ایسوں کو سمجھائے، کوئی ہے جو انسانیت کی اس غیر فطری تقسیم کے پیچ در پیچ الجھے ہوئے پھندوں سے آدم کی اولاد کو خلاصی دلائے، ایک پھندا ہو تو توڑا جائے، ایک گرہ ہو تو کھولی جائے۔

چرمی اختلاف کی تقسیم | آدمی کی تقسیم کا وقت آیا پھر عجب تماشا تھا۔ پھر کچھ لوگ تھے جنہوں نے دیکھنا شروع کیا اور کیا دیکھنا شروع کیا، کھال کو، آدمی کی صرف اس کھال کو جو اس کے بدن پر مڑھی ہوئی تھی، اور اب وہ انسان کو بجز اس چرمی غلاف کے نہ کچھ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھانا چاہتے ہیں

انھوں نے کہا کہ وہ جن کی کھال اور صرف کھال، شدت برودت، یا آفتابی انوار کی تلوینی تاثیر سے محروم ہو کر بے رنگ یا پھیکی پڑ کر رہ گئی ہے ان کی برابری وہ نہیں کر سکتے جن کے چہروں کے رنگ و روغن کو سورج کی کرنوں نے نکھار کر چمکا دیا ہے، انھوں نے پھیکوں یا پھیکے رنگ والوں کا "اجلا" نام رکھا، اور کہا کہ انسانیت کے سارے حقوق ان اہی کے لئے ہیں، اور جو رنگین تھے ان کو "کالے" کے لفظ سے پکارا، اور بولے یہ بھی اجلوں کے لئے اور ان کی محنتوں کی ساری پیداوار بھی ان ہی کے لیے ہے،

رنگ کے اس سطحی اختلاف سے انھوں نے قومیت پیدا کی۔ اور بجائے اس کے کہ اس کو انسانوں کے مختلف افراد کے باہمی معارفت وشناسائی کا ذریعہ بناتے اور یہ سمجھاتے کہ باہر کے اس سطحی اور بیرونی اختلاف پر نہ جاؤ، بلکہ اندرونی اور واقعی طور پر دیکھو کہ سب ایک ہیں اور سب کی

حقیقت ایک ہے لیکن بجائے اس کے انہوں نے اس کو اجنبیت بڑھانے کا آلہ، اور کیسا خطرناک آلہ بنایا کہ، ایک ہی ماں باپ کے بچوں کو جدا کیا، صرف رنگ کے اس ہلکے سے اختلاف کی بنیاد پر جدا کیا۔ دلوں کو جدا کیا، دماغوں کو جدا کیا، شکلوں کو جدا کیا، اور بھیسوں کو جدا کیا، لباسوں اور پوشاکوں کو جدا کیا، اور اس حد تک جدا کیا کہ نہ صرف کرسیوں، اور میزوں، ہوٹلوں اور پارکوں، گاڑی کے درجوں، اور کلاسوں سے، بلکہ عبادت کرنے کی پاک جگہوں سے بھی اس غریب رنگ دار کو دھتکارا۔

اور بات کیا صرف اسی نوبت پر ختم ہو گئی؟ دیکھو! اجلوں کی بھڑکائی ہوئی ذہنیت، اور غلائی ہوئی فطرت نے بالآخر غرانے پر اکسایا، ٹھیک ہڈیوں پر لڑنے والے کتوں کی طرح اکسایا جب ان کے سامنے، کوئی مسکین "کالا" گذرتا ہے تو وہ اس کے خون کے پیاسے ہوئے، اس کے گوشت کے نوچنے کی فکر میں ہانپنے لگے، اور صرف اس لیے ہانپنے لگے کہ اس کے بیرونی پوست کا رنگ وہی کیوں نہیں ہے، جو ان کا ہے حالانکہ اس کی کھال کو ادھیڑ کر دیکھتے تو اس کے خون کو اپنے خون سے اس کے گوشت کو اپنے گوشت سے، اس کی ہڈیوں کو اپنی ہڈیوں سے قطعاً جدا نہ پاتے۔ لیکن رنگ کے مغالطے نے مغالطوں کا ایک انبار پیدا کیا اور کیسا انبار کہ کوئی اس کو صاف نہیں کر سکتا،

"جتنی دیر میں اٹک اٹک کر میں نے یہ الفاظ کہے، وہ شخص میری طرف بڑھا، اور اس نے میرے کانوں پر تان تان کر گھونسے لگانا شروع کیے۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچ کر نیچے اتارنا چاہا، میں نے پیتل کا کٹہرا جو کوچ بکس پر لگا تھا مضبوط پکڑ لیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ چاہے میری کہنی ٹوٹ جائے مگر اسے نہ چھوڑوں گا، مسافر یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ وہ شخص مجھے گالیاں دے رہا ہے"

یہ گالیاں بکتے ہوئے تان تان کر گھونسے مارنے والا کون ہے؟ "اندر" سے صرف ایک ناتراشیدہ کندہ بالکل جاہل سخرم بان ہے جس کے اوپر اتفاق سے اجلی کھال مڑھی ہوئی تھی، اور وہ

مسکین جس کے کانوں کو کچلا جا رہا تھا اور جس کی کہنیاں توڑی جا رہی تھیں، وہ باہر سے اور صرف باہر سے اگرچہ اچھلوں کی زبان میں "کالا" آدمی تھا، لیکن جس کے "اندر" کے متعلق کسی شکرم ہانکنے والے گاڑی کھودنے والے پھیکے رنگ والے کی نہیں بلکہ کنٹربری کے لاٹ "پادری" کی یہ دینی شہادت ہے:۔

"ان کی (یعنی گاندھی کی) زندگی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی جو شان ہے،

وہ آجتک کسی میں نظر نہ آئی" (قوم کی آواز صفحہ ۳۲)

چپ چاپ دم سادھ کر مار کھانے والے آدمی کے متعلق تم کیا خیال کرتے ہو کہ اس نے "اجلوں" کی کسی عورت کو اسی نیت سے گھورا تھا جس نیت سے امریکہ کے حبشی "گوری عورتوں" کو تاکا کرتے ہیں، یقیناً اس کی دھوتی کے کسی گوشے سے آتش گیر مادوں کی وہ پڑیا بھی نہ نکلی تھی جو بنگال کے بمب بنانے والوں کی لنگیوں میں عموماً بندھی رہتی ہے اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ یہ اندر کا جرم اور ایک ایسا مجرمانہ اختیاری فعل ہوتا جس پر آدمی سزا کا مستحق ٹھیرتا ہے، لیکن سزا ہو رہی تھی اور صرف اس قصور میں سزا ہو رہی تھی کہ قدرت نے اس کے رنگ کو اس درجہ پھیکا کیوں نہیں رکھا جو اس شکرم بان کا تھا یا ان لوگوں کا تھا جو اس شکرم میں بیٹھ کر سفر کر رہے تھے۔

شاید غیر اختیاری فعل پر غصہ نہیں آتا اور جس کو آتا ہے اسے مجنون و عقل باختہ ٹھیرایا جاتا ہے لیکن "یورپین شکرم بان" کو گاندھی جی کے اس غیر اختیاری فعل پر نہیں بلکہ صفت پر غصہ آیا اور اس قدر آیا جس کی تصویر گاندھی جی نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں مندرجہ الفاظ میں کھینچی ہے "جس وقت ان کو جنوبی افریقہ کی راہ میں ایک یورپین شکرم بان نے بغیر کسی قصور کے مارا تھا کہ وہ کالے ہندوستانی ہیں"۔

مگر تم نے دیکھا کہ اس گاڑی کے مسافروں نے "شکرم بان" کی عقل میں کسی قسم کا فتور محسوس کیے بغیر اس تماشے کو دیکھا اور کتنے اطمینان سے دیکھا، اور اس کے متعلق دیکھا، جس کا ظاہر اگرچہ "کالا" تھا، لیکن اسی کے باطن میں ان ہی اجلوں کی سب سے بڑی دینی شخصیت "آرچ بشپ آف کنٹربری"

کو (العیاذ باللہ) خدا نہیں تو خدا کے بیٹے کی شان نظر آئی، اُف جو ان کوا تنے سے مسیح معلوم ہوا، دیکھو تو
رنگ اور صرف رنگ کی بنیاد پر وہ انہی کے پاس ناپاک سور اور نجس کتے سے بھی بدتر ٹھیرایا گیا کہ سور کے
پلے بھی منگا دیے جاتے ہیں۔ اور کتوں کے بچے بھی در دراد یے جاتے ہیں، لیکن کھال کے لونی تفاوت
اور صرف لونی تفاوت نے آدم کے بچے کو اس سے بھی بدتر مجرمانہ بدسلوکی کا مستحق قرار دیا،

اور کیا یہ واقعہ صرف مسٹر گاندھی کے ساتھ پیش آیا اور ایک دفعہ پیش آیا؟ کون بتا سکتا ہے کہ
کتنے گاندھیوں کے ساتھ کتنے شکرم بان صبح سے شام تک صرف "جرم رنگ" میں اس سے زیادہ سنگین،
ظالمانہ بیدردیوں کے جگرخراش، زہرہ گداز نظارے نہیں پیش کرتے رہتے ہیں۔

کینوں کے ان شراروں، بغض کی ان چنگاریوں، عداوت کے ان شعلوں کا کون اندازہ
کر سکتا ہے جو رنگ کی اس ہلکی، وسطحی بنیاد پہ بھڑک رہے ہیں، اور بھڑکائے جا رہے ہیں، انہیں کون گن
سکتا ہے، جو اس آگ میں بھنے، اور بھن رہے ہیں، یا آیندہ بھونے جائیں گے۔

رنگ کی تحدید ناممکن ہے رنگ کی بنیاد پر انسانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت سے جدا کرنے
والوں نے کیا کبھی یہ بھی سوچا کہ آخر ان کی یہ تقسیم و تفریق کیا آدمی کو تین یا چار ہی ٹولیوں میں بانٹنے
کے بعد ختم ہو جائے گی، کالے ہوں یا پیلے، کیا ان میں دو حقیقی بھائیوں کا رنگ بھی واقع کے لحاظ
سے بالکل ایک ہو سکتا ہے، عامیانہ اغماض سے اگر کام نہ لیا جائے تو حکیمانہ نظروں میں یقیناً
دو بھائیوں کے چہروں کے رنگ و روغن کی نوعیت بھی اس لحاظ سے کبھی ایک نہیں ہو سکتی، اور جب صرف
جلدی اختلافات ہی کو تقسیم کی بنیاد ٹھیرایا جاتا ہے تو کون روک سکتا ہے اس شخص کو جو آدمیوں کی صف
بندی شکل و صورت، بلکہ ناکوں، اور کانوں کی مشابہت اور عدم مشابہت کی بنیاد پر کرنے لگے کہنے
والے جب یہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں کے انگوٹھوں کی لکیریں بھی باہم متحد نہیں ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ سرسری
نظر میں تمہیں ایسا معلوم ہوتا ہو، لیکن واقعات کے عالموں کا یہ علم نہیں ہے، پھر بتاؤ کہ تقسیم کے وقت جو بھی

انسان کے باطن کو نہیں بلکہ ظاہر کو دیکھا گیا انھوں نے اس دہشت ناک تحریک کی ابتدا نہیں کی ہے جس کا آخری نتیجہ صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کا ہر فرد دوسرے سے جدا ہو جائے اور بغض و عداوت کے ساتھ جدا ہو جائے،

رنگ کا اختلاف اختیاری فعل نہیں ہے

اگر جوانوں کے بالوں کی سیاہی اختیاری فعل نہیں ہے اور بوڑھوں کے سر کی سفیدی میں بڑھاپے کے ارادہ کو دخل نہیں ہے تو پھر کسی ملک کے موسمی حالات نے اگر کسی کے رنگ کو ابھار کر چمکا دیا، اور کسی ملک کے باشندوں کی کھال رنگین نہ ہو سکی تو کیا رنگ کے اس اختلاف میں کسی کی خواہش اور اختیار کو ذمہ دار ٹھیرایا جا سکتا ہے، پھر اضطراری صفات، غیر ارادی کیفیات کو اختیاری جدائی کا معیار کیوں بنایا جاتا ہے، سیاہ بال والے جوان کے لیے اگر یہ جائز نہیں ہے کہ سفید ریش بوڑھے کی توہین کرے تو اجلی کھال والوں کو کس نے اجازت دی کہ رنگین چمڑے والوں کی طرف سے اپنے دل میں نفرت و عداوت کی انگیٹھیاں سلگائیں، کسی کو اس لیے کون مار سکتا ہے کہ اس کا قد کوتاہ کیوں ہے؟ اس لیے فرد جرم کس پر لگائی جا سکتی ہے کہ اس کے قامت میں درازی کیوں پیدا ہو گئی۔

رنگ کا اختلاف اتحاد و اتفاق کے ساتھ بدل نہیں سکتا۔

جو آدمی کو رنگ ہی کی بنیاد پر جدا کر کے تقسیم کرتے ہیں پھر ان سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ قوموں کی لیگ کیوں بنائی جاتی ہے۔ انسان کی عام برادری کا صور کس بنا پر پھونکا جاتا ہے، عام حیات بشری کی حفاظت کے لیے تخفیف اسلحہ کے لیے دعوت کے رقعے مختلف ملکوں میں کیوں بانٹے جاتے ہیں، جنگ کے ختم کرنے کے منصوبے کیوں گانٹھے جاتے ہیں، صلح عالم کے خواب کیوں دیکھے جاتے ہیں جب اختلاف کی بنیاد میں انسان کا معنی نہیں بلکہ صرف صورت ہے، اندر نہیں صرف باہر ہے، ارادی خیالات و جذبات نہیں، بلکہ صرف غیر اختیاری کوائف و صفات ہیں تو بتاؤ کہ کالے چہروں پر گوری کھال کس طرح مڑھی جا سکتی ہے، اور سیاہ رنگ میں زرد رنگ کون بھر سکتا ہے

نسل اور خون کا اختلاف بھی غیر ارادی اور اضطراری ہے

پھر اگر رنگ کا اختلاف انسان کے اختیاری

فعل کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اس کی سطح ظاہر کی ایک اضطراری کیفیت ہے تو کیا یہی حال نسل اور خون کے اختلاف کا نہیں ہے۔

آہ! کہ جو کسی شودر اور چنڈال کے گھر پیدا ہوا، کیا اپنی خواہش سے پیدا ہوا؟ وہ جو اپنے کو کسی سورج بنسی گھرانے میں پاتا ہے، اس کے لیے کوئی ارادی جد و جہد اس نے کبھی کی تھی؟ سلافی نسل میں کوئی اپنے کو اپنے ارادے سے شریک نہیں کرتا اور نہ ٹیوٹنی خانوادوں میں کوئی اپنی کوشش سے اپنے کو پیدا کرا سکتا ہے، سامیوں کا خون اپنی رگوں میں اپنے ہاتھوں سے کوئی خود کبھی نہیں بھرتا، اور نہ آریائی گوشت و پوست کو اپنی ہڈیوں پر کوئی خود چڑھاتا ہے، پھر نسل اور خون کی بنیاد پر جو ایک آدمی کو دوسرے کے سامنے سے ڈھکیلتے ہیں، یا ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بناتے ہیں۔ بتاؤ کہ انھوں نے بھی انسان کو اسی فعل کا ذمہ دار نہیں گردانا جس کا وہ قطعاً ذمہ دار نہیں ہے۔

نسلی اختلاف بھی اتحاد و اتفاق سے بدل نہیں سکتا

اور آدمی کو جب بجائے اندر کے باہر سے، اور بجائے باطن کے ظاہر سے، بجائے حقیقت کے صرف نسب سے بانٹا جائے گا تو الٰہی کی صرف ایک دلدل میں نہیں ان سارے دلدلوں میں انہیں دھنسا ہوا پاؤ گے جن میں رنگ والوں کو تم نے گڑا ہوا دیکھا تھا۔

اگر رنگ کا اختلاف مٹ نہیں سکتا تو کیا نسل کا اختلاف مٹایا جا سکتا ہے؟ جو زید کا پوتا ہو چکا ہے اس کو عمرو کا پوتا کون بنا سکتا ہے کسی راجپوتنی کے پیٹ سے کوئی زمین پر آیا ہے تو اب کسی برہمنی کی کوکھ سے کیسے نکل سکتا ہے؟ پھر سارے انسانوں کی برادری وہ کیسے قائم کر سکتے ہیں جو ابھی آدم کے بچوں کو سامی اور آریائی، تورانی اور ٹیوٹانی نسلوں میں بانٹ رہے ہیں، جو نسل کی بنیاد پر توڑ رہے ہیں کیا انھوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ انسانیت کے مختلف ٹکڑوں کو پھر وہ کس طرح جوڑ لیں گے۔

نسل کی تقسیم بھی پھر کسی حد پر ٹھیر نہیں سکتی

رنگ والوں پر طعنہ تھا کہ ان کی تقسیم پھر کسی حد پر ٹھیر نہیں سکتی لیکن کیا نسل والے اپنی تقسیم کے لئے کوئی آخری خط کھینچ سکتے ہیں؟ اگر آدمی صرف اپنے باپوں اور دادوں

کی وجہ سے بانٹا جا سکتا ہے تو صرف آریائی نسل والے سامیوں سے کیوں جدا کیے جاتے ہیں، آریوں کا ہر گوت، اور ان کا ہر خاندان اسی بنیاد پر اپنے کو دوسرے سے کیوں جدا نہ کرے گا۔ اور گوت و خاندان ہی تک یہ بات کیوں ٹھیرے گی، بجز ایسے دو بھائیوں کے جن کے ماں اور باپ ایک ہی ہیں ہر انسان اس تقسیم کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتا ہے، اور جہاں نسلی جذبات کے اوہام میں شاعرانہ آگ پھونکی گئی، وہاں وہ سب کچھ دیکھا گیا اور ہمیشہ دیکھا جائیگا جس کا دیکھا جانا نسلی تقسیم کے بعد عقلاً ضروری ہے ۔

لسانی تقسیم اور انسانیت کی بیرونی تقسیم کی یہ تو وہ بنیادیں تھیں جو کسی نہ کسی حد تک واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، آخر کھالوں، اور چمڑوں کا سفید و سیاہ ہونا، آدمی کا کسی کا بیٹا یا پوتا ہونا کوئی فرضی بات نہیں ایک واقعہ ہے، توہم نہیں، مشاہدہ ہے لیکن کیا حال ہے ان لوگوں کا جو اندر سے باہر نکلے، باطن سے ظاہر میں آئے، اور پھر وہاں بھی ٹھیر نہ سکے، کیونکہ جو آدمی کو رنگ یا نسل کی بنیادوں پر بانٹ رہے تھے، وہ کچھ ہی کر رہے ہوں تاہم واقعات کی بنیاد پر بانٹ رہے تھے لیکن جنھوں نے کہا کہ پانی کو واٹر کہنے والوں کی برابری وہ نہیں کر سکتے جو پانی کو پانی ہی کہتے ہیں، آخر سوچنا چاہیے کہ زبانوں اور بولیوں کی وجہ سے اور محض ان کی وجہ سے جو نسل انسانی کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے جدا کر رہے ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں ۔

کیا الفاظ کا اشیاء و حقائق کے ساتھ کوئی واقعی تعلق ہوتا ہے، یقیناً پانی ایک سیال حقیقت ہے، اس قدر تو واقعہ ہے لیکن اس کا آب ہونا یا پانی، واٹر ہونا یا ماء ہونا، جل ہونا یا اور کوئی لفظ ہونا یہ بھی کوئی واقعہ ہے؟ ایک فرض ہے ایک خود تراشیدہ اصطلاح ہے، اس سے زیادہ زبانوں کے اختلاف کی اور کیا نوعیت ہے؟

لیکن جنگ ہے جدال ہے، شور ہے ہنگامہ ہے، اور صرف اس بنیاد پر ہے کہ جو پانی کو جل

کہتے ہیں وہ ان سے کبھی نہیں مل سکتے جو اس کی تعبیر پانی یا آب سے کرتے ہیں جو ہاتھ کو ہینڈ کہتے ہیں وہ ان سے ہاتھ نہیں ملا سکتے جو ہاتھ کو ہاتھ کہتے ہیں، اور جب آدمی بجائے اندر کے باہر سے بانٹا جائے گا تو اس کا آخری مآل یہی ہے۔ رنگ اور نسل والوں نے تو صرف آدمی کے باہر کو دیکھا، اور اس کی کھال اور خون کو تقسیم کا معیار ٹھیرایا، پھر کون روک سکتا تھا ان لوگوں کو جنھوں نے کھال اور گوشت سے بھی آگے بڑھ کر ان الفاظ پر کان کھڑے کیے جنھیں بیچارہ آدمی صرف اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی ان الفاظ کی بنیاد پر بانٹا جا سکتا ہے جنھیں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے تو کون ڈانٹ سکتا ہے، ان لوگوں کو جو آدمی کو، ٹوپی اور جوتے، چھڑی اور چھتری رکابی اور کٹوروں کی بنیاد پر بانٹنے لگیں!

آخر ہیٹ پہننے والوں کو ایک قوم، اور شو استعمال کرنے والوں کو دوسری نیشن قرار دیا جائے تو اس پر کون مسکرا سکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ انسانی تقسیم ان بنیادوں پر اگر باضابطہ نہیں تو بے ضابطہ طریقہ سے ہو رہی ہے، اور انسانیت کی تقسیم خدانخواستہ بجائے باطن کے ظاہری بنیادوں پر اگر اسی طرح جاری رہے تو اس قسم کے بوقلموں اقسام انسانی کا ضابطہ کی شکلوں میں سامنے آجانا بہت دور نہیں ہے،

وطنی تقسیم! وہ لوگ جو بجائے نسل، خون و زبان کے آدم کی نسل کو وطنی بنیادوں پر ٹکرا رہے ہیں، سوچو تو سہی کہ آخر وہ کیا کر رہے ہیں، مانا کہ زبان والے، فرضی اصطلاحوں اور خود تراشیدہ مسلمات کی وجہ سے بنتے رہے ہیں، لیکن الفاظ بھی واقعی حقائق ہیں، ان کا تعلق اپنے معانی، اور مصداق سے فرضی ہی کیوں نہ ہو، لیکن بجائے خود کیا الفاظ کی واقعیت سے کوئی انکار کر سکتا ہے وہ سنے جاتے ہیں، لکھے جاتے ہیں، بولے جاتے ہیں ان سے ہوا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے لیکن یہ وطن کیا چیز ہے؟ زمین کا ایک کرہ ہے، یہ خاک کا ایک تودہ ہے پھر جو کہا جاتا ہے کہ، یہ یورپ ہے، اور یہ ایشیا ہے، بلاشبہ کاغذ کے نقشوں پر، آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس کی سطح کا کچھ حصہ سرخ ہے، اور کچھ زرد، کوئی نیلا ہے، اور کوئی سبز، لیکن رنگین سطحیں یا ان کے

درمیان کے ٹیڑھے، ترچھے خطوط، بجائے کاغذ کے زمین کے چہرے پر بھی کبھی دیکھے گئے ہیں؟ یا آئندہ دیکھے جاسکتے ہیں؟ بھوت بھی وہم ہے لیکن بعضوں کا دعوی ہے کہ انہوں نے اسے دیکھا ہے، مگر اس وہم سے بڑا وہم کون ہوسکتا ہے جس کے دیکھنے والے نہ پچھلوں میں تھے نہ اب ہیں، نہ آئندہ ہوں گے نہ اس زندگی میں اس کا مشاہدہ ہوا اور نہ اس کے مرنے بعد اس کے مشاہدہ کا وعدہ ہے اور یہ انجام تھا اس اقدام کا جو انسانیت کی تقسیم میں بجائے باطن کے ظاہر کو سامنے لایا گیا، آدمی اندر سے باہر آیا، باہر سے بھی آگے بڑھا اور بجائے آدمی کے آدمی کی استعمالی چیزوں پر آیا، اور وہاں بھی نہ ٹھیر سکا۔ بالآخر اس تقسیم کا دم اس منحوس بنیاد پر آکر ٹوٹا جس کے نیچے بجز وہم و فریب، دھوکہ اور فرض کے کچھ نہ تھا،

نسل انسانی جن عواقب و نتائج کی شکار رنگ اور نسل کی تقسیم کی بنیاد پر ہوئی زبانی اور وطنی تقسیم میں تقریباً وہ سب باقی رہے کہ زبانی اور وطنی اختلافات بھی تو تقریباً غیر ارادی ہیں، ممکن ہے جس نے ابتدا میں پانی کے لیے پانی کا لفظ وضع کیا ہوگا اس نے تخابی قوت سے اس وقت کام لیا ہو لیکن اس کے بعد جس نے اس کو استعمال کیا یقیناً وہ مادری طور پر اس کے استعمال پر مجبور تھا، اسی طرح جو بجائے افریقہ کے ایشیا میں پیدا ہو گیا قطعاً اس پیدائش میں اس غریب کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی طرح رنگ اور نسل کے اختلافات کو اگر کوئی مٹا نہیں سکتا تو کیا زبان اور وطن کے اختلافات کو کوئی معدوم کر سکتا ہے؟ زبان کے متعلق تو شاید اپنے لحاف کے نیچے کوئی یہ مالیخولیا قائم کرے کہ آدم کی ساری اولاد بالآخر ایک زبان بولنے لگے گی، اگرچہ اس امکان کی گنجائش ماؤف عقلوں کے سوا کہیں اور مشکل سے نکل سکتی ہے لیکن کون ہے جو مختلف وطنوں کو ایک وطن کی شکل میں تبدیل کر سکتا ہے، کیا چین میں ہندوستان سما سکتا ہے یا کلکتہ کو بمبئی میں گھسایا جا سکتا ہے، پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ محض رنگ و نسل ہی کی تقسیم کسی حد پر جا کر قرار نہیں لیتی تھی؟ آخر زبان اور بولیوں کے اختلافات کا احاطہ

کون کرسکتا ہے؟ اور جب الفاظ و آواز کو افتراق کا معیار ٹھہرایا جائے گا تو ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں، تذکیر و تانیث اور اسی قسم کے دوسرے صوبجاتی، ضلعواری تنوعات لسانی پر یہ جنگ کیوں نہیں چھڑ سکتی؟ اردو ایک زبان ہے لیکن دلی والوں کی پیشانیاں سکڑ جاتی ہیں جب ان کے سامنے کوئی لکھنوی اردو ہی بولتا یا لکھتا ہے۔ دکن والوں کی اردو پر وہ کیوں قہقہے لگاتے ہیں، جو اپنے کو جمنا یا گومتی کا باشندہ بتاتے ہیں؟

پھر اگر زبانوں بولیوں، ان کے مختلف لہجوں، اسالیب ادا، کا یہ حال ہے تو کیا وطنی اختلافات بھی کسی حد پر جا کر ٹھیر سکتے ہیں؟ ایشیا والے اگر افریقہ والوں سے جدا کیے جائیں گے تو خود ایشیا والوں میں، ہندوستان والے چینیوں سے اپنے کو علیحدہ کرنے میں کیوں حق بجانب نہ سمجھے جائیں گے

پھر کون ٹوک سکتا ہے، اگر ہندوستان کا ہر صوبہ اپنے کو دوسرے صوبے سے اور صوبہ کا ہر ضلع دوسرے ضلع سے، ضلع کا ہر تعلقہ دوسرے تعلقہ سے تعلقہ کا ہر گاؤں دوسرے گاؤں سے، گاؤں کا ہر محلہ دوسرے محلہ سے محلہ کا ہر ٹولہ دوسرے ٹولے سے، ٹولہ کا ہر گھر دوسرے گھر سے، گھر کے ہر کمرے کا رہنے والا دوسرے کمرہ والے سے کمرہ کا ہر رہنے والا دوسرے رہنے والے سے اپنے کو وطناً جدا سمجھنے لگے۔ اس لیے کہ اگر صرف مقام بود و باش کی بنیاد پر آدمی کا باشندہ صحیح ہے تو یقیناً جس جگہ یہ ایک شخص لیٹا ہوا ہے اسی جگہ میں دوسرے کی گنجائش نہیں پیدا ہو سکتی، ایک قبر میں دو مردے دفن نہیں ہو سکتے۔ کس قدر عجیب دھوکہ ہے جب وطنی فرق میں پھنسائے ہوئے غریب انسان کے سامنے کوئی پہاڑ یا دریا پیش کر دیا جاتا ہے اگر پہاڑوں یا دریاؤں کی بنیاد پر ایک ملک واقعی دوسرے سے جدا ہو جاتا ہے تو پھر جس ملک میں ہر دس قدم کے بعد ایک پہاڑ اور ہر بیس قدم کے بعد کوئی ندی یا دریا ملتا ہے، آخر اس کو ایک ملک یا ایک وطن کیسے سمجھا جاتا ہے؟ بلاشبہ دریا اور پہاڑ کا وجود واقعی ہے لیکن ان پہاڑوں میں کسی خاص پہاڑ کو یا دریاؤں میں کسی خاص دریا کا سرحد قرار دینا اس کی وقعت فرض و رسم سے زیادہ نہیں، آج ہندوستان ہندوکش پر ختم کر دیا جاتا ہے لیکن کون روک سکتا ہے کسی شخص کو اگر وہ بجائے ہندوکش کے کابل کے کسی پہاڑ یا وسط ایشیا کے کسی دریا تک ہندوستان کے حدود کو وسیع کر کے اس کا نام ہندوستان رکھ دے

کتب سماوی پر ایک نظر

کتب ہنود

(۱۵)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

امور تحقیق طلب آیات قرآنی کی بناء پر تمہید میں ہم لکھ چکے ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم ہدایت الٰہی سے محروم نہیں رکھی گئی۔ یہ کلیہ ہم کو اس نتیجہ پر لاتا ہے کہ قوم ہنود کے لیے بھی ہدایت الٰہی یقیناً نازل ہوئی، خواہ یہ ہدایت ہندوستان میں ان کے لیے نازل ہوی ہو، یا وہاں جہاں سے یہ لوگ اس ملک میں آئے۔ اب صرف اس امر کا اطمینان حاصل کرنا باقی ہے کہ وہ سچی ہدایت آج بھی اس قوم میں باقی ہے یا امتداد زمانہ سے وہ بگڑ گئی، مسخ ہوگئی، بدل گئی، اور اپنی اصلی حالت کے اعتبار سے مفقود ہوگئی؟ اس تنقید کے لیے مندرجہ ذیل امور تحقیق طلب ہیں:۔

۱۔ وہ کون کون سی کتابیں ہیں جن کو اس قوم کے لوگ منزل من اللہ قرار دیتے ہیں اور جن پر وہ اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں؟

۲۔ وہ کتابیں کہاں نازل ہوئیں؟ کب نازل ہوئیں؟ طریق نزول ان کا کیا تھا؟ کتنی مدت تک کس ترتیب سے، اور کن حالات میں ان کا نزول ہوتا رہا؟

۳۔ کس پیغمبر یا کن پیغمبروں یا رشیوں یا "اوتاروں" پر ان کا نزول ہوا؟

۴۔ ان کتابوں کے مضامین کا خلاصہ کیا ہے اور ان میں جو تعلیمات مندرج ہیں وہ بنی نوع انسان کی

دینی و دنیوی فلاح میں کس حد تک موثر ہو سکتی ہیں ؟

۵۔ ہندوؤں کے پاس انکے اس دعوی کا کیا ثبوت ہے کہ وہ کتابیں حقیقتاً حق تعالی ہی کی جانب سے ہندوؤں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائی گئی ہیں ؟

۶۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ کتابیں اپنی اصلی صورت میں محفوظ ہیں اور ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل، کمی وبیشی، تحریف و الحاق کا وقوع نہیں ہوا اور ان پر اس درجہ اعتماد کیا جا سکتا ہے جس کی کہ کتب منزل من اللہ مستحق ہیں ؟

تاریخ ہنود | قبل اس کے کہ مذکورۂ بالا امور پر غور کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی تاریخ پر بھی ایک سرسری اور اجمالی نظر ڈالی جائے تاکہ مسائل مذکورہ پر تنقیدی نظر ڈالنے میں حاملان کتب زیر تنقید کے تاریخی حالات سے بھی ضروری مدد لی جا سکے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی تفتیش مقدم ہے کہ واقعات عالم کی صحت کے متعلق حصول یقین میں موجودہ تاریخی مواد کس حد تک قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔

زمانہ باعتبار تاریخی معلومات کے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) عہد تاریخی۔ اور (۲) عہد ماقبل تاریخ۔

عہد تاریخی وہ ہے جس کے واقعات قلمبند یا کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیے گئے ہیں۔

عہد ماقبل تاریخ کا دور تاریخی دور سے قبل کا دور ہے جس کے متعلق کوئی قابل اعتبار مواد موجود نہیں محض اٹکل سے کام لیکر اس کے متعلق کچھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے وثوق کے ساتھ اس عہد کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صرف آثار و قرائن کو دیکھ کر اور وہ بھی محض ظن و قیاس کی بنا پر۔ جو امور کہ اس عہد سے متعلق بالعموم بحث میں آتے ہیں ان میں سے مثال کے طور پر چند مسائل حسب ذیل ہیں :

۱۔ کائنات کا وجود کب سے ہے ؟

۲۔ زمین کب وجود میں آئی؟

۳۔ زمین کی ابتدائی صورت کیا تھی اور اس صورت میں کب کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

۴۔ انسان سے قبل زمین پر کیا تھا کس نوع کی آبادیاں تھیں؟

۵۔ انسان کی ابتدا اس زمین پر کب سے ہے؟

۶۔ انسانی آبادی زمین کے کس حصہ سے شروع ہوی اور آبادی کا پھیلاؤ کس ترتیب زمانی و مکانی کے ساتھ واقع ہوا؟

۷۔ تمدن انسانی کے ابتدائی مدارج کی نوعیت و کیفیت کیا تھی؟ اس ضمن میں یہ مسائل بھی آتے ہیں کہ

۱۔ ہند و اقوام ہندوستان میں کب سے آباد ہیں؟

۲۔ کہاں سے آئیں؟

۳۔ کسی مذہب کو اپنے ساتھ لیکر آئیں یا یہاں آنے کے بعد انھیں کوئی مذہب عطا ہوا؟

۴۔ اگر ہند و اقوام باہر سے آئیں تو ہند میں آکر انھیں کن مزاحمتوں سے سابقہ پڑا؟

۵۔ کس حد تک ان کے تمدن نے اس ملک کو متاثر کیا؟

۶۔ کس حد تک یہاں کے قدیم تمدن سے وہ لوگ خود متاثر ہوے؟

۷۔ یہاں آنے سے قبل کن کن خارجی اثرات سے وہ متاثر ہو چکے تھے اور یہاں آنے کے بعد علاوہ یہاں کے ملکی اثرات کے کن خارجی اثرات سے وہ متاثر ہوتے رہے؟

ظاہر ہے کہ ان جملہ امور کی بابت جو کچھ دور حاضر کے متمدن ممالک میں بیان کیا جاتا ہے وہ نہ کشف والہام کے تحت میں ہوتا ہے نہ تواریخ کی ان مکتوب شہادتوں پر مبنی ہوتا ہے جو تحتہ حسی سے ماوراء ہوں بلکہ اس میں بڑی حد تک ان ظنیات اور قیاس آرائیوں کو دخل ہے جنھیں ایک ترتیب خاص میں لاکر "سائنس" قرار دے دیا گیا ہے اور ان پُر شوکت اسمار کے ساتھ نامزد کر دیا گیا ہے۔

جیالوجی۔ علم طبقات الارض

بائی آلوجی۔ علم الحیات۔

اینتھراپالوجی۔ علم الانسان۔

اینتھنالوجی۔ علم الاقوام۔

فاک لور۔ علم حالات انسانی بذریعہ روایات لسانی۔

آرکالوجی۔ معلومات ماخوذ از آثار قدیمہ۔

سائیکالوجی۔ علم النفس۔

فلالوجی۔ علم السنہ۔

ان جملہ قیاس آرائیوں کی بنیاد مندرجۂ ذیل امور کی موجودہ ناتمام معلومات پر رکھی گئی ہے

۱۔ چٹانوں کی عمر کا اندازہ شکم زمین کے چند اجزار۔ طبقات ارض کی نوعیت میں اختلافات انسان کی ہڈی کے ڈھانچے اور وہ جانور، درخت، اور پودے جو مدت دراز تک زمین میں دفن رہے اور امتداد زمانہ سے جنہوں نے معدنی صورتیں اختیار کر لیں۔

۲۔ چند پرانی تباہ شدہ بستیاں یا ان کے آثار و باقیات جو زمین کھود کر نکالے گئے۔ قدیم مسمار شدہ عمارتیں یا ان کی بنیادوں کے نشانات یا وہ بچے کھچے نشانات جو اِدھر اُدھر نظر آگئے۔

۳۔ قدیم کتبے جو پتھروں پر، غاروں میں، چٹانوں، پرانے ستونوں، یا دھات کے پتروں پر کندہ پائے گئے۔ تصاویر مجسموں یا بتوں کی ساخت و نوعیت۔

۴۔ پرانے سکے اور ان پر کے خطوط۔ پرانے ہتھیار، اوزار، برتنے کی اشیاء جن پر قدامت کی مہر پائی گئی۔

۵۔ ملکی و قومی افسانے جو نظم یا نثر میں مبالغہ آمیز صورتوں کے ساتھ مختلف ممالک میں زبان زد

خاص و عام رہے۔

۶۔ قدیم زبانوں کی چھان بین جو ان کی ملفوظی یا مکتوبی مماثلت اور الفاظ کے مخارج و اشتقاق پر غور و خوض کرنے کے بعد عمل میں لائی گئی۔

۷۔ اُن خطوط و نقوش کی عینک سے بھی اسرار قدامت دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں کوئی صحیح طور پر نہیں سمجھتا اور جن کی تفہیم میں قیاس آرائیوں کے سوائے چارہ نہیں۔ مثلاً مصری ہائی راگلفکس

۸۔ علم النفس کی روشنی میں فطرت انسانی پر نظر ڈالکر قیاس کیا گیا ہے کہ دُکھ، درد، خوشی، غم، فکر، اطمینان، محبت، عداوت میں طبعاً انسان کے کیا حرکات و سکنات ہوتے ہیں۔ پھر اس پر اقوام کی تمدنی و معاشرتی کیفیات اور قومی خصوصیات کی عمارتیں تعمیر کرلی جاتی ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ان قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہمیشہ اور ہر حالت میں صحیح ہونا لازمی ہے مندرجہ بالا علوم قدیم نہیں بلکہ جدید ہیں معلومات و انکشافات جن پر ان کی بنیاد ہے اب تک نہایت محدود و ناقص ہیں۔ آئے دن معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جدید انکشافات پرانے نظریوں کو بدل دیا کرتے ہیں۔

مثلاً آریہ قوم کے متعلق عہد ماقبل تاریخ کے واقعات یا ان واقعات کے متعلق مفروضات کو لیجیے ایک عرصہ تک اسی خیال کا اظہار ہوتا رہا کہ یہ لوگ زمانہ نامعلوم میں وسط ایشیا میں تھے وہاں سے چلے، شمال و مغرب کے پہاڑوں سے اُترے اور ہندوستان پر چھاگئے۔ وسط ایشیا میں ان کے وطن اصلی کے متعلق کوئی تاریخی یا غیر تاریخی شہادت یا روایات زبانی یا قرائن آثاری موجود نہیں۔ صرف اتنا امر تحقیقی ہے کہ یہ لوگ شمال و مغرب کے پہاڑوں سے نکلے۔ اس سے قیاس کرلیا گیا کہ وسط ایشیا سے آئے ہوں گے پھر یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ وسط ایشیا ہی ان کا وطن اصلی ہوگا۔ اس "ہوگا" نے لوگوں کے خیال میں "ہے" کی صورت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ اس صورت میں وہ پختگی آگئی کہ اس کے خلاف کچھ

کہا جائے تو بڑے بڑے تعلیمیافتہ لوگ بھی چونک اٹھتے ہیں۔

مگر موجودہ حکومت ہند کے آثار قدیمہ کی جانب سے سندھ و بلوچستان میں تلاش آثار قدیمہ کا جو کام آج کل ہو رہا ہے اس کے ابتک کے نتائج نے تعلیمیافتہ طبقہ کو بھی آریوں کے وطن اصلی کے قدیم نظریے کی بابت شبہ میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر میکے کی جدید تصنیف دی انڈس سویلیزیشن THE Indus Civilization ملاحظہ فرمائیے محکمہ آثار قدیمہ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر این جی مجمدار جو کی حال کی تصنیف ایکسپلوریشن اِن سندھ (Exploration in Sind) کا خوب غور سے مطالعہ فرمائیے۔ سندھ میں موہن جودارو اور لوہن جودارو اور لیمو نے جو اور قلات (بلوچستان) میں نل کے مقامات پر آثار قدیمہ کی تلاش کے نتائج سے اس کتاب میں تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ثابت کرا گیا ہے کہ جو لوگ زمانہ قدیم میں تمدن لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے وہ مغربی ایشیا یعنی بابل وغیرہ سے آئے۔ ان تحقیقاتی قافلوں میں سر آریل اسٹائن بھی شریک تھے جو ایک جرمنی النسل انگریز ہیں۔ اور برٹش میوزیم لندن اور ہارورڈ یونیورسٹی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شریک تفتیش ہوئے تھے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کے ٹائمس آف انڈیا میں ان کا مکالمہ شائع ہوا ہے جس کے ایک حصہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"آریہ لوگ کہاں سے آئے؟ کس طرف گئے؟ کون سا راستہ انھوں نے اختیار کیا؟ ان کی ابتدائی زبان کی کیا کیا نشانیاں باقی ہیں؟ ان کی مفتوح قومیں اب کہاں اور کس حال میں ہیں؟"

"چودھویں صدی قبل مسیح کی جتنی تحریروں سے پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو ویدک دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور سنسکرت زبان کی بولیوں میں سے کوئی بولی بولتے تھے علاقہ مِتّنی (Mittani) میں مویشی چرانے والوں کی زندگی بسر کرتے تھے یہ علاقہ اس حصۂ زمین پر واقع تھا۔

جو آج کل کردستان کے نام سے موسوم ہے"

حتّی سے بنی حت کی جانب اشارہ ہے جنھیں انگریزی میں (Hittites)
کہتے ہیں اور جن کا ذکر توریت کی کتاب پیدائش کے ابواب ۱۰ و ۲۳ میں موجود ہے۔ ان کی سلطنت ایشیاء کوچک اور شام میں پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی قوی تھی کہ صدیوں مصر و عراق کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی رہی۔ یہ وہی ملک تھا جہاں نمرود حکمران رہا۔ ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ بنی اسرائیل کی حکومت رہی اسی ملک پر داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے نبوت اور بادشاہی کی اسی ملک میں شہر حبرون (Hibron) واقع ہے جس کا ذکر توریت میں آیا ہے۔ اور جہاں ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے مزارات مقدسہ موجود ہیں۔ شہر حبرون بیت المقدس سے ۸ میل جنوب و مغرب کے جانب واقع ہے اور آج کل الخلیل کے نام سے ہے۔ حت کنعان کا بیٹا تھا۔ کنعان حام کا۔ اور حام نوح علیہ السلام کے فرزندوں میں سے تھے۔ شام میں بنی حت کی حکومت کا زور ۲۰۰۰ قبل مسیح کے قریب میں بیان کیا جاتا ہے۔ ۷۱۷ قبل مسیح تک یہ حکومت قائم رہی تحقیقات جدیدہ کی رو سے ان لوگوں نے دنیا کے قدیم تمدن کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔ بقول سر اسٹائن کے ان لوگوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں آریہ ہونے کے علامات پائے جاتے تھے، جو آریوں کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور آریوں کی زبان بولتے تھے کسی زمانہ میں شام اور ایشیائے کوچک میں مویشی چرایا کرتے تھے۔ آگے چلکر سر اسٹائن فرماتے ہیں کہ:-

> ان لوگوں نے ایک ہزار اور دو ہزار برس قبل مسیح کے درمیان پنجاب کو فتح کیا۔ پھر شمالی ہند میں انھوں نے اپنی زبان اور اپنے اثر کو پھیلایا، یہانتک کہ رفتہ رفتہ ان کا تمدن تمام جزیرہ نمائے ہند پر چھا گیا۔

اِن فتوحات کی تفصیل دریافت کرنے کے لیے کوئی تاریخی مواد موجود نہیں۔ مگر اتنی بات بالکل یقینی ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو آریہ کہتے ہیں اور رگ وید اپنے پاس رکھتے ہیں سندھ و پنجاب میں مغرب سے آئے۔ جغرافی حالات تبلا رہے ہیں اور اس امر کی تائید کر رہے ہیں کہ یہ ملک شام یا ایشیاء کوچک سے نکلے اور ایران و بلوچستان ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوئے۔ آج سندھ کی آب و ہوا خشک ہے مگر چار یا پانچ ہزار برس قبل کافی مرطوب تھی۔

وادی سندھ سے متصل آغاز تاریخ سے ایک قوم آباد ہے جس کی بولی وہ مشرقی ایرانی زبان ہے جو اپنی قدیم ترین صورت میں زرتشت کے گیتوں میں محفوظ ہے اور جو ویدک سنسکرت کی ایک شاخ معلوم ہوتی ہے۔

دریائے سندھ کے حصۂ زیرین کے مغربی ساحل پر ایک سیدھی سادھی مبتدیانہ تمدن والی مختصر سی براہمن قوم آباد ہے۔ دراوڈین زبان بولتی ہے حالاں کہ اس زبان کے بولنے والے ان سے بہت فاصلے پر دکن میں رہتے ہیں۔ یہ ایک معما ہے جو اس طرح بآسانی حل ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان جو ملک حائل ہے اس میں ایسے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن پر دراوڈین زبان کے حروف کندہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلاکت زدہ نیم برہنہ خانہ بدوش لوگ جو کہ معدودے چند ہیں ان کثیر التعداد دراوڈین لوگوں سے برادرانہ نسبت رکھتے ہیں جو آریوں کے آنے سے قبل پورے ملک پر حکمران تھے اور جن کا تمدن آریوں کے تمدن سے بہت بڑھا ہوا تھا مگر جو قوت وہمت میں آریوں کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوئے۔ یہ دریا پار والا ضعیف فرقہ پچھلے سے ایک

گوشہ عافیت میں کھسک گیا۔ اور ہزاروں برس سے وہ وہاں قائم ہے۔

زبان سنسکرت کے تغیرات مابعد اور آریوں کے تمدن و مذہب میں آئے دن کی ترمیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریوں نے اپنی زبان اور اپنی حکومت کو ملک کے باشندگان قدیم پر زبردستی ٹھونسا مگر ان کے نہایت برتر تمدن اور ان کی بہت سی مذہبی خصوصیات کو خود بھی قبول کرلیا اور انھیں اپنا بنالیا۔ ہند و اقوام میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بلکہ یہ اب بھی ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح اپنے فاتحوں کو جذب کر لینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں"۔

اقتباس مندرجہ بالا سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بعیدہ میں ایک آریہ یا آریوں سے مشابہ قوم ممالک شام و ایشیا رکوچک یا اس نواح میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی تھی اور مویشی چراتی تھی۔ مگر تلاش سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مثل عام خانہ بدوش قبائل کے یہ لوگ امن پسند اور گوشہ عافیت کی خاموش زندگی بسر کرنے والے نہ تھے بلکہ سرکش بغاوت پسند اور حکومت کے خلاف شورش اٹھانے کے عادی تھے۔

چنانچہ برٹش انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۴۳ ۵ و ۴۴ ۶ پر بابل (Babylo nia) کے قدیم تاریخی حالات کی بحث میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں ہتی حت بابل پر حکمران تھے ایک قوم تھی "جو غالباً آریہ تھی"۔ یہ قوم ایک مدت تک بابل پر حملہ آور ہوتی رہی یہانتک کہ ملک پر وہ قابض ہوگئی۔ ۵۷۰ برس تک اس کا غلبہ رہا۔ اس کے عہد میں بابل کردنیاش (Karduniash) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے بادشاہوں کے نام "غیر سامی بلکہ اغلباً آرین تھے"۔ مثلاً اشپیہ۔ کلیہ۔ ادا سی عراق کے شمال و مغرب میں ایک زبردست آریہ حکومت قائم ہوگئی تھی جہاں اندر اور ورونا اور مترا کی پرستش ہوتی تھی جو کہ ہندوستان پر چڑھ دی

کرنے والے آریوں کے دیوتاؤں کے نام ہیں۔

جہاں تک موجودہ تاریخ دانی کا تعلق ہے ہندوستان کے قدیم ترین باشندے وہ بھیل اور گونڈ اور دیگر قبائل بیان کیے جاتے ہیں جو آج کل وسط ہند اور دکن کے جنگلوں اور پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا اس نسل انسانی سے تعلق ہے جس کے آثار آسٹریلیا میں پائے گئے ہیں اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ آسٹریلیا اور جاوا جیسے مقامات سے ہندوستان میں آئے ہوں گے۔ انھیں (Pre-Dravadian Races) کہتے ہیں۔ انھیں لوگوں پر دراویڈین لوگوں نے چڑھائی کی جو غالباً مغربی ایشیا سے نکلے اور بلوچستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ اپنے زمانہ کے لحاظ سے نہایت درجہ متمدن اور ستعلیق تھے۔ ان کا تسلط ہندوستان پر پوری طرح ہو گیا اور بہت عرصہ تک رہا۔ تعین زمانہ کے لئے کوئی قابل وثوق مواد دستیاب نہ ہوسکا انھیں لوگوں پر یعنے ڈراویڈینز پر آریہ لوگ حملہ آور ہوئے۔ اس حملہ آوری کا زمانہ ۲۴۰۰ برس اور ۱۵۰۰ برس قبل مسیح کے درمیان بیان کیا جاتا ہے مگر اس میں بڑا اختلاف ہے۔ ہندو اصلی زمانہ کو اس سے بھی قدیم تر بتلاتے ہیں اور یورپین محققین اسے نزدیک تر قرار دیتے ہیں۔ آریوں نے پہلے سندھ و پنجاب پر قبضہ کیا اور کچھ عرصہ تک وہیں مقیم رہے۔ پھر مشرق کی جانب رخ کیا اور رفتہ رفتہ وہ بنگال تک پہنچ گئے۔

اس درمیان میں ڈراویڈین قوم کے لوگ شمالی ہند سے نیچے اترتے گئے یہاں تک کہ دریائے نربدا سے نیچے آگئے اور دکن میں آکر اڑ گئے۔ دکن سے یہ لوگ آریوں پر حملہ آور بھی ہوتے رہے اور ان کے بڑھتے ہوئے غلبہ کی شدید اور مسلسل مخالفت بھی کرتے رہے۔ اس وجہ سے آریوں کا اثر دکن میں بہت دیر میں اور بہت ضعیف ہو کر پہنچا۔ اب بھی یہ قدیم قوم دکن میں بڑی تعداد میں آباد ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (طبع چہار دہم) جلد ۱۲ میں "انڈیا" پر آرٹیکل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈراویڈین لوگ ۰۰ ۷ برس قبل مسیح تک ہند کے ساحل جنوب و مغرب اور ملک بابل کے درمیان بذریعہ جہازوں کے تجارت کرتے رہے اور بابل سے سامی زبانوں میں سے ایک زبان کے وہ حروف لائے جن پر آج ہندی، برمی، سیامی اور سلونی زبانوں کی تحریریں مبنی ہیں۔

پروفیسر آرتھر میگڈانل اپنی کتاب "تاریخ زبان سنسکرت" میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر بوہلر (Buhler) نے بڑی محنت و جانکاہی اور بڑی تحقیق و تنقید کے بعد ثابت کیا ہے کہ ہند قدیم میں دو قسم کی تحریروں کا رواج تھا۔ کہروشتی اور براہمی۔

(۱) کہروشتی ملک گندہارا (یعنی مشرقی افغانستان اور شمالی پنجاب) میں ۴۰۰ برس قبل مسیح سے لیکر ۲۰۰ برس بعد ولادت مسیح تک مروج رہی۔ اس رسم الخط کا ماخذ سامی تحریر کی وہ ارمی قسم ہے جو ۵۰۰ برس قبل مسیح رواج پائے ہوئے تھی۔ کہروشتی تحریریں مثل اپنی اصل کے داہنی جانب سے بائیں جانب کو لکھی جاتی تھیں (مثل اردو فارسی عربی کے، نہ کہ مثل ناگری اور انگریزی کے)۔

۲۔ براہمی خط کو ہندی قومی تحریر کہنا چاہیے کیونکہ بعد کے کل اقسام کے حروف خواہ وہ بادی النظر میں آپس میں کیسے ہی مختلف معلوم ہوتے ہوں سب اسی خط پر مبنی ہیں۔ یہ حروف و عبارات باب بائیں جانب سے داہنی جانب کو لکھی جاتی ہیں مگر یہ ان کا ابتدائی اور اصلی رخ نہیں۔ ۴۰۰ برس قبل مسیح کے کچھ سکے دستیاب ہوئے ہیں جن پر رخ تحریر داہنی جانب سے بائیں جانب ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ براہمی حروف اس قدیم ترین سامی رسم الخط پر مبنی ہیں جو کہ کسی زمانے میں سامیوں کے مقبوضات شمالی میں رائج تھا اور جو ۸۹۰ برس قبل مسیح کے کتبوں اور دفائن وغیرہ پر کندہ کیا ہوا پایا گیا ہے۔ ڈاکٹر بوہلر کی رائے ہے کہ یہ حروف ہند میں ۸۰۰ برس قبل مسیح لائے گئے۔ براہمی حروف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ شمالی اور جنوبی۔ قسم شمالی میں سنسکرت مرہٹی اور ناگری لکھی جاتی

ہے۔ انہیں ناگری یا دیوناگری حروف کہتے ہیں۔ قسم جنوبی میں وہ تحریریں شامل ہیں جو وندھیاچل کے جنوب میں ممالک کینری اور تلنگانہ میں مستعمل ہیں۔ ناگری کے قدیم ترین نسخے آٹھویں صدی تک کے اور قلمی نسخے گیارہویں صدی تک کے دستیاب ہو چکے ہیں۔

بیانات مذکورہ بالا کے دیکھنے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا بابل میں ہونا بیان کیا گیا ہے اور جن کے آثار قدامت سندھ و بلوچستان میں پائے گئے ہیں وہ فی الحقیقت آریہ ہی تھے یا کہ ڈراویڈین؟ اور بابل میں وہ کہاں سے پہنچے؟ اس کے جواب کی تلاش کے لیے مندرجہ ذیل نظریے ہی قائم ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ آریہ ہی ہوں علاوہ اس کے کہ وہ اپنے نام اور اپنے دیوتاؤں کی پرستش اپنے ہمراہ لے کر یہاں سے وہاں گئے یا وہاں سے یہاں آئے۔ "یہاں" سے مراد وسط ایشیا ہو یا ہندوستان لیکن وسط ایشیا سے انکا خروج محض قیاس ہی قیاس ہے۔ ان کے عہد قدیم کے کوئی آثار وہاں مطلق نہیں پائے جاتے۔ اور ہندوستان میں وہ فاتحانہ شان رکھتے تھے عقل تسلیم نہیں کرتی کہ اس ملک میں اپنے غلبہ کی شان کو چھوڑ کر وہ وہاں آوارہ گردی اور خانہ بدوشی کے لیے گئے ہوں اور یہاں سے وہاں جا کر انھوں نے وحشی چرانا شروع کر دیا ہو۔ لہٰذا اگر یہ لوگ آریہ تھے تو اغلب ہے کہ وہیں سے یہاں آئے ہوں۔ اگر یہ خیال صحیح نکلا تو ان کے یہاں آنیکا زمانہ ہزار بارہ سو برس قبل مسیح ہی قرار دیا جائے گا۔ اور اس کے خلاف جتنے دعوے ہیں اُن سب کو رد کر دینا پڑے گا۔

۲۔ یا ممکن ہے کہ یہ لوگ وسط ایشیا سے نہیں بلکہ ایران سے نکلے ہوں اور بابل پہنچے ہوں مگر ایران سے ان کا بابل جانا پھر وہاں سے واپس ایران آنا پھر ایران سے ہندوستان کا رخ کرنا محض قیاس ہی قیاس ہو سکتا ہے۔ کوئی قرینہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ ایرانیوں اور آریوں

میں بلحاظ زبان اور مذہب کے جو مشابہت و مماثلت ہے اس کے دوسرے وجوہ ہیں جن میں سے بعض پر وید کے تحت میں بحث آئے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک ہی لوگ تھے جن میں سے ایک ہی زمانہ میں بعض بابل گئے اور رفتہ رفتہ وہاں سلطنت کرنے لگے اور بعض ہندوستان آگئے اور رفتہ رفتہ یہاں حکومت کرنے لگے تو اس صورت میں سندھ کے دفائن میں قدیم بابلی تمدن کے آثار کا پایا جانا بے معنی ہو جائے گا۔

۳۔ یا ممکن ہے کہ یہ لوگ دراصل ڈراویڈین تھے اور بارثانی وہاں پہنچے۔ پہلی مرتبہ ایک بعید اور نامعلوم ماضی میں یہ لوگ وہاں سے ایران بلوچستان اور سندھ کی راہ سے آئے اور ہندوستان کی قدیم آبادیوں کو مغلوب کر کے یہاں کے مالک بن بیٹھے۔ آگے چل کر اپنے تمدن کو ان لوگوں نے اتنی ترقی دی کہ جہازوں کے ذریعہ مغربی ممالک سے یہ تجارت کرنے لگے جنمیں بابل بھی شامل تھا۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں ان کے مزدور پیشہ طبقہ کا ایک گروہ اُن کے ہمراہ باہر نکلا ہو اور بابل میں رہ پڑا ہو۔ اس طبقہ نے پہلے وہاں مبتدیانہ مشاغل شروع کیے ہوں۔ مثلاً محنت مزدوری کاشتکاروں اور زمینداروں کی ملازمت، مویشی پالنا اور انھیں جنگل پہاڑوں میں لیئے لیے پھرنا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لوگ وہاں کے حصۂ ملک پر قابض بھی ہو گئے ہوں۔ معلوم نہیں کہ ہندی دیوتاؤں کی پرستش کی رسم آریوں نے ڈراویڈینس سے لی یا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مگر سر اسٹائن کے مندرجہ بالا قول سے یہ تو اخذ ہوتا ہے کہ ڈراویڈینس میں بھی براہمن ہوتے تھے جن کا بقیہ اب تک دریائے سندھ کے حصۂ زیرین کے مغربی ساحل پر موجود ہے اور اپنی اصلی ڈراویڈین زبان بولتا ہے یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ تمدن اور مذہب کی بہت سی خصوصیات میں آرین طبقہ ڈراویڈین اثر کو پوری طرح قبول کر چکا ہے۔ اس لیے کیا عجب ہے کہ جو حقیقتاً ڈراویڈین خصوصیات تھیں وہ بابل یا کہ اس ہندی الاصل فرقہ میں غلطی سے آرین خصوصیات سمجھ لیے گئے اور ہندی الاصل ناموں اور دیوتاؤں کو آرین قرار دیدیا گیا یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اُن ڈراویڈین لوگوں نے اپنے جتھے کا نام آریہ رکھ لیا ہو جس کے معنی بقول پروفیسر میکڈانل اصنف

تاریخ زبان سنسکریت کے "ایک ہی خاندان ایک ہی برادری اور کنبہ رشتہ کے لوگ" ہیں۔ مدت تک اس شاداب ملک اور وہاں کی صحت بخش آب و ہوا میں رہ کر یقینی امر ہے کہ ان کا رنگ و روغن بدل گیا ہوگا، اُن کے قوائے جسمانی مضبوط ہوگئے ہوں گے اور صوری اعتبار سے وہ ایک بالکل جداگانہ قوم معلوم ہونے لگے ہوں گے۔ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ خود بھی اپنی اصل کو بھول گئے ہوں اور انھیں یاد بھی نہ رہا ہو کہ ان کے آبا و اجداد ڈراویڈین ہی ہیں۔ فتوحات کے نشہ میں وہ پہلے ایران پھر ہندوستان آنکلے اور ڈراویڈین لوگوں کو اپنا غیر بلکہ اپنا مزاحم پاکر اور اپنے مقابلہ میں ان کی کالی کالی صورتیں دیکھ کر انھیں بھوت اور راکشس سمجھا اور انھیں کچلنا شروع کر دیا۔ گویا ایک ہی قوم تھی جو پہلے ڈراویڈین بن کر ہندوستان آئی پھر ایک مدت بعد رنگ و روپ بدل کر اور اپنی اصل کو بھول کر آریہ بن کر دوبارہ اس ملک میں آئی اور اپنے ہاتھ سے اپنے ہی بھائی بندوں کی جڑیں کاٹنی شروع کر دیں۔ اس نظریہ کی تائید جپسیوں (Gypsies) کے وجود سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک خانہ بدوش قوم ہے جو یورپ میں آج کل تخمیناً پانچ لاکھ کی تعداد میں موجود ہے۔ ٹرکی، بلقان، روس، اٹلی، اسپین، فرانس، جرمنی، آسٹریا، انگلستان میں یہ لوگ پھیلے ہوئے ہیں بلکہ امریکہ تک پہنچ گئے ہیں۔ انگلستان میں ان کی تعداد چالیس ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ مصر سے آئے اور اسی بنا پر انھیں جپسیز کہتے ہیں جو کہ لفظ (Egyptians) سے بنایا گیا ہے لیکن اب یہ امر طے پاگیا ہے کہ یہ لوگ ہندی الاصل ہیں اور ہندوستان سے یورپ پہنچے۔ ان کے قافلے کے قافلے یورپ میں گھومتے رہتے ہیں۔ خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں بھان متی اور بازی گری کے تماشے دکھلاتے ہیں۔ چٹائی اور ٹوکریاں بنتے ہیں۔ ٹین کے برتن بناتے اور مرمت کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص طریقوں سے لوگوں کے ہاتھ دیکھتے ہیں اور اُن کے نوشتۂ تقدیر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں کی بدولت یورپ اور امریکہ میں قیافہ بالید Palmistry

کا اس قدر چرچا پھیلا ہوا ہے۔ دکن کے خانہ بدوش قبائل اور سرکی والوں سینگی والوں، موگیوں بھان متیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ برٹش انسائیکلوپیڈیا والا لکھتا ہے کہ:۔

"ان کے اعضاء جسم کا تناسب، ان کی جلد کا زیتونی رنگ، ان کی آنکھیں اور ان کے بالوں کا سیاہ ہونا، ان کے حرکات و سکنات، ان کا گانا بجانا، باوجود یورپ کی زبانوں سے مخلوط ہو جانے کے ان کی بولی اور ان کی زبان کی صرف و نحو غرض کہ ان کا پورا طرز بود و باش ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ ہند سے آئے۔" ممکن ہے کہ ڈراوڈین کی وہ کھیپ جو بابل گئی تھی ان کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی ہو قافلے کے کچھ لوگ بابل رک گئے ہوں کچھ آگے بڑھ گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بار ایسا ہوا ہو یا متعدد بار۔ بہرحال ان لوگوں کا وجود اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ڈراوڈین سمندر سے ڈرتے نہ تھے۔ جہاز کے سفر سے انھیں پرہیز نہ تھا۔ دور و دراز ممالک میں جاتے تھے، تجارت کرتے تھے، وہاں سے مفید چیزیں اور مفید علوم اپنے ملک میں لاتے تھے اور ان میں سے بعض ان دور و دراز ممالک میں رہ بھی پڑتے تھے۔ اب رہا زبان کا مسئلہ۔ تو وہ اس طرح طے ہو سکتا ہے کہ اسبات کا بھی امکان ہے کہ بابل کے ہندیوں نے ایرانیوں کی صحبت میں رہکر جو کہ ان کے پڑوسی تھے قدیم ہند کی زبان اور قدیم ایران کی زبان کے امتزاج سے بتدریج ایک ایسی زبان بنالی یا ایسی زبان بن جانے دی جس کو قدیم سنسکرت یا ویدک زبان سے آج کل موسوم کیا جاتا ہے۔ علم السنہ کے فاضلوں کا اتفاق ہے کہ قدیم ایرانی زبان اور قدیم سنسکرت باہم اس درجہ مشابہ ہیں کہ انھیں ایک ہی زبان کی دو بولیاں یا دو (Dialects) کہدیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

۴۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ نہ آریہ تھے نہ ایرانی نہ ڈراوڈین، بلکہ مصری تھے مصر کا تمدن بابل کے تمدن سے بھی قدیم تر ہے مصر و بابل میں لڑائیاں بھی ہوتی رہی ہیں باہم دوستانہ تعلقات بھی رہے ہیں۔ دونوں تمدنوں نے ایک دوسرے کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ لوگوں میں

آمد و رفت اور رشتہ داریاں بھی رہی ہیں۔ آبادیوں میں مبادلہ بھی ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون کی تباہی کے بعد کچھ قبطی مصر سے نکل بھاگے تھے تعجب نہیں اگر یہی قبطی پہلے بابل میں کچھ دن بسے ہوں پھر ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آگئے ہوں۔ ان مصریوں میں اور ان ہندوں میں جن سے کہ ان مضامین میں بحث ہے مذہب و رسمیات میں مشابہت بھی بہت قریبی ہے مثلاً اتنک ہندوؤں میں مصر جی مہاراج بھی ہوا کرتے ہیں جو ہندوؤں کے بڑے پنڈت اور پوجاری اور قابل احترام مذہبی پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ گائے کی پرستش بالخصوص اور جانوروں کی پرستش بالعموم میں مصریوں کو اولیت کا مرتبہ حاصل ہے۔ آفتاب کی پرستش دریائے نیل کی پرستش یعنی عناصر کی پرستش اور انسانی قربانیاں مصر کی مشہور ہیں۔ تناسخ کا عقیدہ مصر کی خصوصیات سے ہے جس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر آئے گی۔ "اوتار" کا مسئلہ بھی سب سے پہلے مصر ہی میں پیدا ہوا۔ بادشاہ کی پرستش مصریوں کا گویا مذہب تھا۔ ذات پات کا لحاظ اور چھوت چھات کے جھگڑے جس شد و مد کے ساتھ مصر میں تھے اتنے کسی اور ملک کی تاریخ میں نہیں پائے جاتے، بلکہ خیال یہ ہے کہ اونچ ذات اور نیچ ذات میں تفریق کی ابتدا مصر ہی سے ہوئی ان جملہ امور میں ہندوستان بھی مصر ہی کا خوشہ چین معلوم ہوتا ہے چند دیگر امور میں بھی مصریوں اور ہندیوں میں مماثلت ہے مگر ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ تعجب کی بات نہ ہوگی اگر مزید تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ وہ قبطی ہی ہیں جنہوں نے ہندوستان آکر نیا جنم لیا۔ کم از کم اتنا تو اب بھی ثابت ہے کہ ہندی تمدن و رسوم و رواجات قبطی یا مصری اثر سے محفوظ نہیں۔

۵۔ اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل کے گم شدہ اور مفقود الخبر قبائل میں سے ہوں۔ ان گم شدہ قبائل کے متعلق اتنک بڑی عرق ریزی سے کام لے کر ضخیم لٹریچر مہیا

کر دیا گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ تین خیالات جن کو زیادہ وسعت دی گئی ہے حسب ذیل ہیں۔

الف۔ اینگلو سیکسن لوگ ان گم شدہ قبائل سے ہیں اور انہیں اینگلو ازرائیلائٹس (Anglo-Israilites) کہنا چاہیے۔ مگر یہ خیال مقبول نہیں ہوا۔ اور اس پر بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔

ب۔ شمالی امریکہ کے قدیم باشندے (North American Indians) ان کے گم شدہ اسرائیلیوں میں سے ہونے کی بابت آج کل بڑا زور لگایا جا رہا ہے۔ اور چند بڑے بڑے لوگ اس خیال کی تائید میں کوشاں ہیں۔ مگر اس نظریہ پر بھی بہت سے اعتراضات ہو اور رد ہو سکتے ہیں۔

ج۔ افغانیوں پر بنی اسرائیل کے مفقود الخبر قبائل ہونے کا گمان کیا جاتا ہے۔ مگر کسی تاریخی شہادت کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس تخیل کی بنا پر کہ ان کی خصلتیں بنی اسرائیل کی خصلتوں سے بہت مشابہ ہیں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے ملک کے بعض طبقوں کے لکھ پتی اور کروڑ پتی مہاجنوں کو بنی اسرائیل سے متعدد وجوہ سے نہایت قوی مناسبت ہے علاوہ بریں شام جیسی سرسبز و شاداب زمین کا لطف اٹھائے ہوئے من چلے لوگ جو من و سلوا پر قناعت نہ کر سکے اپنے زمانے کے اجڑے ہوئے انگلو سیکسن جزائر یا مسافت بعیدہ پر سمندر پار غیر آباد و نامعلوم امریکن خارستان، یا مفلس و مشقت طلب افغانی سنگستانی کو ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا چھوڑ کر بھلا کیوں جانے لگے تھے۔ اگر یہ خیال جائے کہ بنی اسرائیل کو دیوتا پرستی سے کیا تعلق تو ادنیٰ تعمق سے واضح ہو جائے گا کہ جس قوم نے موسیٰ علیہ السلام

کی چالیس دن کی غیر حاضری میں باوجود ہارون علیہ السلام کی نگہبانی کے گوسالہ پرستی اختیار کر لینے میں دریغ نہ کیا، اس سے بعد کے زمانوں میں کیا کچھ ممکن نہیں۔ ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے۔ بنی اسرائیل کے بارہ فرقے تھے۔ ان میں سے کمتر باقی اور بیشتر مفقود الخبر ہیں جن کو بنی اسرائیل کے گم شدہ فرقے (Losttribes of Israel) کہتے ہیں۔ اب ذرا خیال تو فرمایئے کہ ایک بچہ یا ایک لڑکے یا چند افراد اور ایک مختصر سی جماعت کا گم ہو جانا تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر ایک انبوہ کثیر کا جو متعدد و کثیر التعداد قوموں پر مشتمل ہو گم ہو جانا اور ان کی بابت کسی کو کچھ معلوم نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ بجز اس کے کہ ان لوگوں نے کسی مصلحت سے خود ہی اپنے آپ کو اپنے پرانے نام اور پرانی علامات سے جدا کر لیا اور اپنے نام اور بعض کو بدل کر کسی دوسرے نام سے اپنے کو مشہور کر دیا۔ ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مصائب و شدائد و غلامی و تباہی و بربادی اور مظلومی و بے کسی و بے بسی کی موت گویا ان کی قسمت ہی میں آچکی تھی۔ ان کے حرکات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ان کے نام تک سے لوگوں کو نفرت ہو گئی تھی بلکہ اس نفرت کے آثار اب تک مہذب و آزاد یورپ میں نہایت بین طور پر نمایاں ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اس آئے دن کی مصیبت سے بچنے کے لیے اپنے پرانے نام ہی کو خیرباد کہدو اور کسی دوسرے نام سے دوسرے ملک میں جا کر چھپو۔ لوگ نام، لباس و ہیئت ظاہری بدل سکتے ہیں مگر اپنی طینت و فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں وہ قدیم اور عجیب و غریب تاریخ رکھنے والے لوگ جن پر اس نظریے کی رو سے اسرائیلی ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے، اب تک سیاسیات و معاشیات و اقتصادیات میں تقریباً اسی روش اور اسی قابلیت کا ثبوت دے رہے ہیں جس کے ساتھ تاریخ میں وہ متمیز ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ مصر میں بھی تقریباً چار سو برس رہ چکے ہیں یوسف علیہ السلام کے زمانے میں وہاں پہنچے اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں وہاں سے نکلے اس لیے مصری خصوصیات ان میں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ یونانی اور ایرانی صحبتوں سے انہوں نے

کافی اثر قبول کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ انہیں کے ذریعہ ہمارے ملک میں اسرائیلی، مصری، شامی، یونانی اور ایرانی اثرات آئے ہوں۔ اگر اس نظریہ کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو ابراہیم سے برہم اور برہما اور براہما اور برہمن کا استخراج آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے اور ہولی کا تہوار ایک جدید تاریخی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ لوگ بھی شرافت نسل پر فخر کرنے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بنی اسرائیل ہونے پر انہیں اس قدر ناز تھا کہ اپنے کو خدا کی منتخب جماعت اور خدا کی اولاد اور خدا کا دوست کہتے تھے اور جنت کو اپنے ہی لیے مختص سمجھتے تھے۔ اغیار کی نجات کے قائل نہ تھے۔ ان کی اکثر جماعتیں اغیار کو اپنے میں شامل نہ کرتی تھیں۔ گویا یہ لوگ اس زمانہ اور ان ممالک میں بھی "برہمن" تھے۔ علمی اور دماغی کاموں میں یہ لوگ ہمیشہ ایسے چمکتے رہے ہیں کہ اب تک ان میں آئن اسٹائن جیسی قابلیت کے لوگ پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ غرض کہ اس نظریے کی تائید میں بھی بہت کافی مواد موجود ہے۔

(باقی)

اسلام اور ضبطِ ولادت

(۲)

مغربی تجربہ کے دو سبق اشاعت گذشتہ میں تحریک ضبط ولادت کی ترقی کے اسباب اور اس کے نتائج کا جو تفصیلی بیان پیش کیا گیا ہے اس کو بنظر غائر ملاحظہ کرنے سے دو اہم حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں:۔

ایک یہ کہ اہل مغرب میں ضبط ولادت کی خواہش پیدا ہونا، اور اس تحریک کا اس کثرت سے ان کے افراد میں رائج ہو جانا، کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کی فطرت ہی توالد و تناسل سے پرہیز کا اقتضار کرتی ہے، بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ دو صدیوں سے ان کے ہاں تمدن و تہذیب اور معیشت و معاشرت کا جو نظام رائج ہے، اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن میں وہ اولاد سے بچنے اور توالد و تناسل سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اگر یہ حالات نہ ہوتے تو وہ اب بھی اُسی طرح ضبط ولادت سے بیگانہ رہتے جس طرح انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں تھے۔ کیونکہ ان کی جو فطرت اس زمانے میں اولاد کی محبت اور توالد و تناسل کی جانب رغبت کا اقتضار کرتی تھی، وہی فطرت اب بھی موجود ہے۔ ۶۰ سال کے اندر اس میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ ضبط ولادت کے رواج سے مغربی قومیں جن خطرات و مشکلات میں گھر گئی ہیں، انھوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ضبط ولادت کی تحریک، قوانین فطرت میں جو ترمیم کرنا چاہتی ہے وہ انسان کے لیے سخت نقصان دہ ہے، اور درحقیقت فطرت کے قوانین لائق ترمیم نہیں ہیں بلکہ وہ نظام تمدن و تہذیب اور نظام معیشت و معاشرت بدل دینے کے لائق ہے جو انسان کو قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر مجبور کر کے ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

اصول اسلام مغربی تجربہ کے یہ دو سبق ہم کو اصول اسلام سے بہت قریب لے جاتے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اور اس نے شخصی و اجتماعی طرز عمل کے لیے جتنے طریقے مقرر کیے ہیں وہ سب اس قاعدۂ کلیہ پر مبنی ہیں کہ انسان اُن قوانین فطرت کی پیروی کرے جن پر کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے! اور کوئی ایسا طرز زندگی اختیار نہ کرے جو قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر قائم ہو، یا ان کی خلاف ورزی پر اس کو مجبور کرتا ہو۔ قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کر کے اس کی جبلت میں اس طریقہ کی تعلیم بھی ودیعت فرما دی ہے جس پر چل کر وہ چیز نظام وجود میں اپنے حصہ کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتی ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۲)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شئے کو اس کی خاص بناوٹ عطا کی پھر اس کو ان اغراض کے پورا کرنے کی راہ بھی بتادی جن کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔

کائنات کی تمام چیزیں بے چون وچرا اس ہدایت کی پیروی کر رہی ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ان کے لیے جو راستہ مقرر فرمایا ہے اس سے ہٹنے کی ان میں قدرت ہی نہیں۔ البتہ انسان کو یہ قدرت دی گئی ہے کہ وہ اس راستہ سے ہٹ سکتا ہے، اس پر چلنے سے انکار کر سکتا ہے۔ اپنی عقل اور ذہانت سے کام لے کر اس کے خلاف دوسرے راستے نکال سکتا ہے، اور کوشش کر کے ان پر چل بھی سکتا ہے، لیکن وہ راستہ جسے انسان خدا کے بتائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کے اتباع میں اختیار کرتا ہے، ٹیڑھا راستہ ہے، اور اس کی پیروی گمراہی ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ (۲۸ : ۵)

اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جس نے اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ دیا۔

یہ گمراہی ظاہر میں خواہ کتنی ہی مفید نظر آئے، لیکن درحقیقت جو انسان اللہ کے بتائے ہوئے

راستے کو چھوڑتا ہے اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کیونکہ انجام کار میں اس کی غلط کاری خود اسی کے لئے نقصان دہ اور موجب ہلاکت ثابت ہوتی ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ — اور جس کسی نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا اس نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ (۶۵:۱)

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی بناوٹ کو بدلنا اور ان قوانین فطرت کو توڑنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جاری کیا ہے، دراصل ایک شیطانی فعل ہے، اور شیطان ہی اس فعل کی تعلیم دیتا ہے

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۴: ۱۸) — شیطان نے کہا کہ میں اولاد آدم کو حکم دوں گا کہ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں۔

اور شیطان کون ہے؟ وہ جو ازل سے انسان کا کھلا دشمن ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ ۔ (۲۱:۲) — اور تم شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو بدی اور بے حیائی کے کام کرنے کا حکم دیتا ہے۔

پس اسلام نے جس قاعدے پر اپنے نظام تمدن و تہذیب اور نظام معیشت و معاشرت کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان انفرادی اور مجموعی حیثیت سے اپنی فطرت کے تمام مقتضیات کو ٹھیک ٹھیک قوانین فطرت کے مطابق پورا کرے اور اللہ کی دی ہوئی تمام قوتوں سے اس طریقہ پر کام لے جس کی ہدایت خود اللہ نے دی ہے۔ نہ کسی قوت کو معطل و بیکار بنائے نہ کسی قوت کے استعمال میں اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے انحراف کرے، اور نہ شیطانی تحریص و ترغیب سے گمراہ ہو کر اپنی فلاح و بہبود ان طریقوں میں تلاش کرے جو فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر نکلتے ہیں۔

تمدن اسلام میں ضبط ولادت کی گنجائش ہی نہیں | اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اسلام پر نگاہ ڈالیں گے

تو آپ دیکھیں گے کہ اسلامی نظام تمدن نے سرے سے ان اسباب ودواعی کا ہی استیصال کر دیا ہے جن کی وجہ سے انسان اپنی فطرت کے اس اہم اقتضاء یعنی توالد و تناسل سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے برتھ کنٹرول کی ضرورت داعی نہیں ہوتی، نہ اس کی عین سرشت اس کا اقتضاء کرتی ہے۔ بلکہ ایک خاص طرز کا نظام تمدن جب کسی انسانی جماعت میں مخصوص قسم کے حالات پیدا کر دیتا ہے، تب انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی آسایش اور اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اپنی آیندہ نسل کا سلسلہ منقطع کر دے، یا اس کو بڑی حد تک گھٹانے کی کوشش کرے۔ اس سے آپ خود یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی تمدن اس خاص طرز سے مختلف طرز پر قائم ہو، اور اس میں وہ مخصوص قسم کے حالات پیدا ہی نہ ہوں، تو سرے سے وہ مشکلات اور وہ دواعی وجود ہی میں نہ آئیں گے جو انسان کو اللہ کی بناوٹ کے بدلنے، اور اس کی حدود سے تجاوز کرنے، اور قوانین فطرت کے مقتضیات سے انحراف کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

اسلام کے نظام معاشی نے سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دی ہے وہ سود کو حرام کرتا ہے اجارہ داری کو روکتا ہے، جوے اور سٹے کو ناجائز قرار دیتا ہے، مال جمع کرنے سے منع کرتا ہے، اور زکوٰۃ و وراثت کے طریقے جاری کرتا ہے یہ احکام ان بہت سی خرابیوں کا استیصال کر دیتے ہیں جنہوں نے مغربی معاشی زندگی کو سرمایہ داروں کے سوا اور سب کے لیے ایک مستقل عذاب بنا دیا ہے۔

اسلام کے نظام معاشرت نے عورت کو وراثت کے حقوق دئے ہیں مرد کی کمائی میں اس کا حق مقرر کیا ہے۔ اور عورت کے دائرۂ عمل کو فطری حدود میں تقسیم کیا ہے، عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کو حجاب شرعی کے ذریعہ سے روک دیا ہے، اور اس طرح معیشت و معاشرت کی ان بہت سی خرابیوں کو دور کر دیا ہے جنکی وجہ سے عورت اپنے فطری فرض، افزائش نسل و تربیت اولاد سے انحراف کرنے پر آمادہ یا مجبور ہوتی ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات انسان کو سادہ اور پرہیزگارانہ زندگی بسر کرنا سکھاتی ہیں وہ زناکاری اور شراب خواری کو حرام کرتا ہے۔ رقص و سرود سے (جو قوی ترین محرکات زنا میں سے ہے،) روکتا ہے بہت سے اُن تفریحی مشاغل اور عیش پسندانہ تفریحات کی راہ بند کرتا ہے جو انسان کو فضول خرچ بناتے ہیں۔ لباس، مکان اور آرائش و آسائش کے اسباب میں کفایت شعاری برتنے کی تاکید کرتا ہے، اور اس بد اخلاقی، اسراف اور حد سے بڑھی ہوی لذت پرستی کا استیصال کر دیتا ہے، جو مغربی ممالک میں برتھ کنٹرول کی ترویج کے اہم اسباب میں سے ہے اس کے ساتھ اسلام آپس کی ہمدردی اور امداد باہمی کی تعلیم دیتا ہے صلۂ رحمی کی تاکید کرتا ہے ہمسایوں کی مدد، اور غریب و نادار ابنائے نوع پر انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیتا ہے، اور خود غرضی و نفس پرستی سے روکتا ہے۔ یہ سب چیزیں ایک طرف انسان میں منفرداً، اور دوسری طرف سوسائٹی میں مجتمعاً ایک ایسا اخلاقی ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس میں ضبط ولادت کے داعیات پیدا ہی نہیں ہوتے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام نے خدا پرستی کی تعلیم دی ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے اور یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کر دیتا ہے کہ اس کا اور ہر جاندار کا اصلی رازق حق تعالیٰ ہے یہ چیز انسان میں وہ ذہنیت پیدا ہی نہیں ہونے دیتی جس سے وہ اپنی زندگی میں صرف اپنے ہی ذرائع اور اپنی ہی کوشش پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کے اجتماعی قوانین اور اس کی اخلاقی تعلیمات اور روحانی تربیت نے ان اسباب و دواعی میں سے ہر سبب اور ہر داعیہ کو مٹا دیا ہے جو مغربی تمدن و تہذیب میں ضبط ولادت کے لیے باعث تحریک ہوئے ہیں۔ اگر انسان ذہنی و عملی حیثیت سے ایک سچا مسلمان ہو تو نہ کبھی اس کے نفس میں ضبط ولادت کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے، اور نہ اس کی زندگی میں ایسے

حالات پیش آسکتے ہیں جو اس کو فطرت کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے پر مجبور کر دیں۔

یہ تو مسئلہ کا سلبی (Negative) پہلو تھا۔ اب ہم کو ضبط ولادت کے متعلق اسلام کا فتویٰ ایجابی (Positive) پہلو سے دیکھنا چاہیے کہ ضبط ولادت کے متعلق اسلام کا فتویٰ کیا ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا ہے کہ تغییر خلق اللہ ایک شیطانی فعل ہے۔ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ (۴: ۱۸) اس آیت میں تغییر خلق اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو جس غرض کے لیے بنایا ہے، اس کو اس غرض اصلی سے پھیر کر کسی دوسری غرض کے لیے استعمال کیا جائے، یا اس طور پر اس سے کام لیا جائے کہ غرض اصلی اس سے فوت ہو جائے۔ اس قاعدہ کلیہ کے تحت ہم کو دیکھنا چاہیے کہ عورت اور مرد کے زوجی تعلق میں "خلق اللہ" یعنی اس تعلق کی فطری غرض کیا ہے، اور ضبط ولادت سے تغییر خلق اللہ لازم آتی ہے یا نہیں۔ خود قرآن مجید اس سوال کے حل میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کے زوجی تعلق کی دو غرضیں بتاتا ہے

ایک یہ کہ :۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ (۲: ۲۸)۔	تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں پس تم جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ اور اپنے لیے آیندہ کا بندوبست کرو۔

اور دوسری یہ ہے کہ :۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (۳۰: ۳)	اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہیں میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کی۔

پہلی آیت میں عورتوں کو "کھیتی" کہہ کر ایک حیاتی حقیقت (Biological fact) کا اظہار کیا گیا ہے حیاتیات (Biology) کے نقطہ نظر سے مرد کی حیثیت کاشتکار کی ہے اور عورت کی حیثیت کھیتی کی اور ان دونوں کے تعلق سے فطرت کی اولین غرض بقائے نوع ہے۔ اس غرض میں انسان اور حیوان اور نبات سب مشترک ہیں۔

دوسری آیت میں اس تعلق کی ایک اور غرض بھی بیان کی ہے، اور وہ قیام تمدن ہے، جس کی بنیاد شوہر اور بیوی کے باہم مل کر رہنے سے پڑتی ہے۔ یہ غرض انسان کے لیے مخصوص ہے، اور انسان کی مخصوص بناوٹ ہی میں ایسے داعیات پیدا کر دیئے گئے ہیں جو اس کو اس غرض کے پورا کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔

خلق اللہ کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے کارخانہ کو چلانے کے لیے منجملہ بہت سے انتظامات کے دو زبردست انتظام کیے ہیں۔ ایک تغذیہ۔ دوسرے تولید۔ تغذیہ کا مقصد یہ ہے کہ جو انواع اس وقت موجود ہیں وہ ایک مدت معینہ تک زندہ رہ کر اس کارخانہ کو چلاتی ہیں۔ اس کے لیے رب العالمین نے غذا کا وافر سامان مہیا کیا، اجسام نامیہ (Organic Bodies) میں غذا کو جذب کرنے اور اس کو اپنا جز بنانے کی قابلیت پیدا کی، اور ان میں غذا کی طرف ایک طبیعی خواہش پیدا کر دی جو ان کو غذا حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے اگر یہ نہ ہو تو تمام اجسام نامیہ (خواہ نباتات ہوں یا حیوانات یا انسان) ھلاک ہو جائیں اور اس کارخانہ عالم میں کوئی رونق باقی نہ رہے لیکن فطرت الٰہیہ کے نزدیک اشخاص و افراد کے بقا کی بہ نسبت انواع و اجناس کا بقا زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اشخاص کے لیے زندگی کی ایک بہت ہی قلیل مدت ہے، اور اس کارخانہ کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اشخاص کے مرنے سے پہلے دوسرے اشخاص ان کی جگہ لینے کے لیے پیدا ہو جائیں۔ اس دوسری اعلیٰ اور اشرف ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فطرت نے تولید کا انتظام کیا ہے۔ انواع میں نر

اور مادہ کی تقسیم، نر و مادہ کے اجسام کی جداگانہ ساخت دونوں میں ایک دوسرے کی جانب میلان اور زوجی تعلق کے لیے دونوں میں ایک زبردست خواہش کا موجود ہونا، یہ سب کچھ اسی غرض کے لیے ہے کہ دونوں مل کر اپنی موت سے پہلے اپنے جیسے افراد اللہ تعالیٰ کے اس کارخانہ کو چلانے کے لیے پیدا کر دیں۔ اگر یہ غرض نہ ہوتی تو سرے سے نر و مادہ یا مرد و عورت کی علیحدہ علیحدہ اصناف پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

پھر دیکھیے کہ جو انواع کثیر الاولاد ہوتی ہیں۔ ان میں فطرت نے اولاد کی محبت کا کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں کیا کہ وہ اپنے بچوں کی نگرانی اور حفاظت کریں۔ اس لیے کہ یہ انواع محض اپنی کثرت تناسل کے بل پر قائم رہتی ہیں۔ لیکن جن انواع کی اولاد کم ہوتی ہے ان میں اولاد کی محبت پیدا کی گئی ہے اور ماں باپ کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ ایک کافی عرصہ تک اپنی اولاد کی نگرانی و حفاظت کریں یہاں تک کہ وہ خود اپنی حفاظت کے قابل ہو جائیں۔ اس معاملہ میں انسان کا بچہ سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے اور زیادہ مدت تک ماں باپ کی نگرانی کا محتاج رہتا ہے۔ دوسری طرف انواع حیوانی میں شہوت کا جذبہ یا تو موسمی ہوتا ہے۔ یا جبلی مطالبات کے تحت محدود ہوتا ہے لیکن انسان میں یہ جذبہ نہ تو موسمی ہے اور نہ جبلت نے اس کو محدود کیا ہے۔ اس لیے نوع انسانی میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے ساتھ دائمی تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔ یہی دونوں چیزیں انسان کو مدنی الطبع بناتی ہیں یہیں سے گھر کی بنیاد پڑتی ہے، اور گھر سے خاندان اور خاندان سے قبیلے بنتے ہیں اور آخرکار اسی بنیاد پر تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

اس کے بعد انسانی ساخت پر غور کیجیے حیاتیات کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کی بناوٹ میں شخصی مفاد پر نوعی مفاد کو ترجیح دی گئی ہے اور انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس کی ذات سے زیادہ اس کی نوع کے مفاد کے لیے ہے (انسان کے جسم میں اس کے زوجی غدد (Sexual glands) سب سے زیادہ اہم خدمات انجام دیتے ہیں، یہ غدد

ایک طرف انسان کے جسم کو وہ مارا لحیات (Harmon) بہم پہنچاتے ہیں جو اس میں حسن وجمال، رونق وتازگی، ذہانت اور تیزی، توانائی اور قوت عمل پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری طرف یہی غدے انسان میں تولید کی قوت پیدا کرتے ہیں، جو عورت اور مرد کو تناسل کے لیے باہم ملنے پر مجبور کرتی ہے۔ جس وقت انسان نوعی خدمت کے لیے، مستعد ہوتا ہے، وہی زمانہ اس کے شباب اور حسن اعمل کا بھی ہوتا ہے، اور جب وہ نوعی خدمت کے قابل نہیں ہوتا تو وہی زمانہ اس کے بڑھاپے اور ضعف کا ہوتا ہے، زوجی تعلق کا کمزور ہونا ہی دراصل آدمی کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اگر انسان کے جسم سے اس کے زوجی غدد نکال دیئے جائیں تو جس طرح وہ نوعی خدمت کے قابل نہیں رہتا اسی طرح شخصی خدمت کے لیے بھی اس کی قابلیت بہت کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ ان غدود کے بغیر اس کی دماغی اور جسمانی قوتیں نہایت کمزور ہوتی ہیں۔

عورت کے جسم میں نوعی مفاد کی خدمت کو مرد سے بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عورت کے جسم کی ساری مشین اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہ بقائے نوع کی خدمت انجام دے۔ وہ جب اپنے شباب کو پہنچتی ہے تو ایام ماہواری کا دور شروع ہوجاتا ہے جو ہر مہینے اس کو استقرار حمل کے لیے تیار کرتا رہتا ہے۔ پھر جب نطفہ قرار پاتا ہے تو اس کے پورے نظام جسمانی میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ بچے کا مفاد اس کے تمام جسم پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ اس کی قوت کا صرف اتنا حصہ اس کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جتنا اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے، باقی ساری قوت بچے کے نشوونما میں صرف ہوتی ہے۔ یہی چیز ہے جو عورت کی فطرت میں محبت قربانی اور ایثار (Altruism) پیدا کرتی ہے اور اسی لیے پدریت کا رابطہ اتنا گہرا نہیں جتنا مادریت کا رابطہ ہے۔ وضع حمل کے بعد عورت کے جسم میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہوتا ہے۔ جو اسے رضاعت کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس زمانہ میں غدد رضاعت ماں کے خون سے بہترین اجزاء جذب کرکے بچے کے لیے دودھ مہیا کرتے ہیں، اور یہاں فطرت الٰہیہ پھر عورت کو نوعی مفاد کے لیے

قربانی پر مجبور کرتی ہے۔ رضاعت کے بعد عورت کا جسم از سر نو ایک دوسرے استقرار حمل کے لیے
تیار کیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک عورت اس نوعی خدمت کے
لیے مستعد رہتی ہے۔ جہاں اس کی یہ استعداد ختم ہوئی اور اس کا قدم موت کی طرف بڑھا۔ سن یاس
شروع ہوتے ہی اس کا حسن و جمال رخصت ہو جاتا ہے، اس کی شگفتگی، اس کی جولانی طبع، اس کی
جاذبیت کافور ہو جاتی ہے، اور اس کے لیے جسمانی تکالیف، اور نفسانی افسردگی کے ایک ایسے دور
کا آغاز ہوتا ہے جو صرف موت ہی کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لیے
بہترین زمانہ وہ ہے جب وہ نوع کی خدمت کے لیے جیتی ہے، اور جب وہ صرف اپنے لیے جیتی ہے
تو بری طرح جیتی ہے۔ [1]

اس بحث سے قرآن مجید کے اس ارشاد کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ عورت اور
مرد کے درمیان زوجی تعلق پیدا کرنے سے فطرت کا اصل مقصد بقائے نوع ہے، اور اس کے ساتھ دوسرا مقصد
یہ ہے کہ انسان عائلی زندگی (Domestic life) اختیار کر کے تمدن کی بنیاد
رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان جو کشش رکھی ہے، اور ان دونوں کے زوجی تعلق
میں جو لذت پیدا کی ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ انسان اپنی طبیعی رغبت سے ان مقاصد کو پورا
کرے۔ مگر جو شخص محض اس لذت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اور ان مقاصد کی خدمت بجا لانے سے
انکار کرتا ہے، وہ یقیناً خلق اللہ کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے وہ ان اعضا اور ان قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ
نے بقائے نوع کے لیے عطا کیے ہیں، انکی غرض اصلی کے خلاف محض اپنی نفسانی غرض کے لیے استعمال کرتا

[1] اس موضوع پر ایک روسی مصنف (Anton Nemilov) نے ایک بہترین کتاب لکھی ہے
جس کا نام (Biological Tragedy of Woman) ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اس کا انگریزی
ترجمہ لندن سے شایع ہوا ہے۔

ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو محض زبان کی لذت حاصل کرنے کے لیے عمدہ عمدہ غذاؤں کے نوالے منہ میں چبائے مگر حلق کے نیچے اتارنے کے بجائے ان کو تھوک دے جس طرح ایسا شخص خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے، اسی طرح وہ شخص جو زوجی تعلق سے محض لذت حاصل کرتا ہے، اور بقائے نسل کے مقصد کو پورا نہیں ہونے دیتا، وہ نسل کشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ فطرت کے ساتھ دغابازی کر رہا ہے۔ فطرت نے اس فعل میں جو لذت رکھی ہے۔ وہ دراصل معاوضہ ہے اس خدمت کا جو وہ فطرت کے ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے بجالاتا ہے۔ لیکن یہ شخص معاوضہ تو پورا لے لیتا ہے، اور خدمت بجالانے سے انکار کر دیتا ہے۔ کیا یہ دغابازی نہیں؟

تغییر خلق اللہ کی سزا آئیے اب ہم دیکھیں کہ جو شخص فطرت کے ساتھ یہ دغابازی کرتا ہے، کیا فطرت اس کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیتی ہے، یا اس کی کچھ سزا بھی دیتی ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ اس کی سزا ضرور دی جاتی ہے، اور وہ سزا یہ ہے کہ ایسا شخص خود ہی اپنے آپ کو نقصان اور ٹوٹے میں مبتلا کرتا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (۱۴۰:۶) وہ لوگ ٹوٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے قتل کیا اور اس نعمت کو جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی اللہ پر افترا باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیا

اس آیت میں قتل اولاد کے ساتھ نعمت تناسل کو اپنے لیے حرام کر لینے (یعنی ضبط ولادت) کا نتیجہ بھی خسران بتایا گیا ہے[۲]۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ خسران کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

---

[۲] قدیم مفسرین نے حرموا ما رزقھم اللہ سے مراد صرف حلال غذاؤں کی تحریم ہی لی ہے اس لیے کہ ان کے زمانے میں ضبط ولادت کی تحریک کوئی وجود ہی نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جس کا علم ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جو ہو چکی ہیں اور ہونے والی ہیں، ایسے وسیع الفاظ استعمال کیے ہیں جو صرف حلال غذاؤں کی تحریم ہی کو نہیں بلکہ ہر اس نعمت کی تحریم کو شامل ہیں جو اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اور چونکہ یہاں قتل اولاد کے بعد ہی تحریم رزق کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ لوگ ٹوٹے میں ہیں جو اولاد کو پیدا ہونے کے بعد قتل کر دیتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی ٹوٹے میں ہیں جو اولاد کی پیدائش ہی کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔

جسم و نفس کا نقصان | توالد و تناسل کا معاملہ چونکہ براہ راست انسان کے جسم اور نفس سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے ہم کو سب سے پہلے ضبط ولادت کے ان اثرات کی تحقیق کرنی چاہیے جو انسان کے نفس اور جسم پر مترتب ہوتے ہیں۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انواع میں نر و مادہ کی دو الگ الگ صنفیں بنانے سے فطرت کا اصل مقصد ہی توالد و تناسل اور بقائے انواع ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ نر و مادہ کی عین فطرت اس کا اقتضا کرتی ہے کہ وہ اولاد پیدا کریں، اور خصوصاً نوع انسانی میں عورت کے اندر طبعاً اولاد کی خواہش اور محبت کا ایک زبردست داعیہ پیدا کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے جسم میں اس کے زوجی غدد کا کتنا قوی اور گہرا اثر ہے، اور کس طرح یہ غدد انسان کو نوع کی خدمت پر ابھارنے اور اس میں حسن، توانائی، عملی سرگرمی اور ذہنی قوت پیدا کرنے کے دوہرے فرائض انجام دیتے ہیں خصوصاً عورت کے متعلق آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے جسم کی پوری مشین ہی خدمت بقائے نوع کے لیے مناسب بنائی گئی ہے، اور اس کی تخلیق کا اہم ترین مقصد یہی ہے، اور اس لیے اس کی عین فطرت اس سے اس خدمت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان سب امور کو پیش نظر رکھ کر آپ کی عقل خود اس نتیجہ پر پہنچ سکتی ہے کہ جب انسان زوجی تعلق سے محض لذت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس مقصد کو پورا کرنے سے انکار کر دیگا جس کی طلب اس کے جسم کے ریشہ ریشہ میں اس قدر گہرائی کے ساتھ پیوست کر دی گئی ہے، تو ممکن نہیں کہ اس کے نظام عصبی اور اس کے زوجی غدد کی فعلیت پر اس کے بُرے اثرات مترتب نہ ہوں، اور ان اثرات سے اس کا نفس محفوظ رہ سکے۔

تجربہ اس عقلی نتیجہ کی تائید کرتا ہے سنہ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ عظمیٰ کے نیشنل برتھ ریٹ کمیشن نے ضبط ولادت کے مسئلہ پر طبی نقطۂ نظر سے جو رپوٹ شائع کی تھی اس میں لکھا ہے۔

مانع حمل وسائل کے استعمال سے مردوں کے نظام جسمانی میں بری پیدا ہو سکتی ہے

عارضی طور پر ان میں مردانہ کمزوری یا نامردی بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ ان وسائل کا کوئی زیادہ برا اثر مرد کی صحت پر نہیں پڑتا البتہ اس بات کا ہمیشہ خطرہ ہے کہ مانع حمل وسائل کے استعمال سے جب مرد کو زوجی تعلق میں اپنی خواہشات کی پوری تسکین حاصل نہ ہو گی تو اس کی عائلی زندگی کی مسرتیں غارت ہو جائیں گی۔ اور وہ دوسرے ذرائع سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کریگا جو اس کی صحت کو برباد کر دیں گے اور ممکن ہے کہ اسے امراض خبیثہ میں مبتلا کر دیں۔"

عورتوں کے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:۔

"جہاں طبی لحاظ سے منع حمل ناگزیر ہو، یا جہاں بچوں کی پیدائش حد سے زیادہ ہو، وہاں تو منع حمل کی تدابیر عورت کی صحت پر بلاشبہ اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ لیکن جہاں ان میں سے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، وہاں منع حمل کی تدابیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے نظام عصبی میں سخت برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں بدمزاجی اور چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے جب اس کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی تو شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ نتائج ان لوگوں میں زیادہ نمایاں دیکھے گئے ہیں جو عزل (Ccitus - Interuptus) کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر میری شارلیب (Marysharlieb) اپنے چہل سالہ تجربات کے نتائج ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

"ضبط ولادت کے طریقے خواہ وہ فرزجے (Pessaries) ہوں یا

جراثیم کش دوائیں، ربڑ کی ٹوپیاں اور لفافے یا دوسرے طریقے، بہرحال ان کے استعمال سے کوئی فوری نمایاں نقصان تو نہیں ہوتا لیکن ایک عرصہ تک ان کو استعمال کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے عورت میں عصبی ناہمواری (Nervous instability) پیدا ہو جاتی ہے پژمردگی، شگفتگی کا فقدان، افسردہ دلی، طبیعت کا چڑچڑا پن اور اشتعال پذیری، غمگین خیالات کا ہجوم، بے خوابی، پریشان خیالی، دل و دماغ کی کمزوری، دوران خون کی کمی، ہاتھ پاؤں کا سُن ہو جانا، جسم میں کہیں کہیں ٹیسیں اٹھنا، ایام ماہواری کی بے قاعدگی، یہ ان طریقوں کے لازمی اثرات ہیں۔"

بعض دوسرے ڈاکٹروں نے بیان کیا ہے کہ اعوجاج رحم Falling of the Womb سیلان، فولہ کی خرابی اور بسا اوقات مراق، خفقان اور جنون جیسے عوارض بھی ان طریقوں کے استعمال سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ زیادہ عرصہ تک جس عورت کے ہاں بچہ نہیں ہوتا اس کے اعضاء تناسل میں ایسے تغیرات واقع ہوتے ہیں جن سے اس کی قابلیت تولید (Fertility) متاثر ہو جاتی ہے اور اگر کبھی وہ حاملہ ہو تو اس کو زمانہ حمل اور وضع حمل میں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔[۱]

پروفیسر لیونارڈ ہل ایم بی اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:-

"بلوغ کے وقت عورت کے جسم میں جتنے تغیرات ہوتے ہیں سب تناسل کے مقصد ہی کیلئے ہوتے ہیں۔ ایام ماہواری کے دورے اسی غرض کے لیے

[۱] ڈاکٹر آنلڈ لوراند (Lurand) نے اپنی کتاب Life Shortening habits and Rejuvination میں تدابیر مانع حمل کے مضر اثرات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

یہ کتاب سنہ ۱۹۲۲ء میں فلیڈلفیا سے شائع ہوئی ہے۔

ہوتے ہیں کہ بار بار عورت کو استقرار حمل کے لیے تیار رکھیں۔ ایک نا کتخدا عورت یا ایسی عورت میں جو اپنے آپ کو استقرار حمل سے روکتی ہے، ایام کا ہر دورہ ان تمام اعضاء کی ناامیدی کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ جو اس دورہ میں حمل کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ اس اقتضائے طبیعی کے پورا نہ ہونے اور تناسلی عضا کے معطل رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تناسلی اعضاء کی فعلیت میں برہمی و بدنظمی پیدا ہو، ایام ماہواری تکلیف اور بے قاعدگی کے ساتھ آئیں، چھاتیاں ڈھلک جائیں، چہرے کی رونق اور خوبصورتی رخصت ہو جائے اور مزاج میں اشتعال پذیری یا افسردگی پیدا ہو جائے۔"

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی زندگی میں اس کے زوجی غدد کا بڑا اثر ہے۔ جو غدے زوجی قوت پیدا کرتے ہیں، وہی انسان میں توانائی، حسن اور چستی بھی پیدا کرتے ہیں انہی سے انسان میں کیرکٹر کی بہت سی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ زمانۂ بلوغ کے قریب جب ان غدوں کا عمل تیز ہو جاتا ہے، تو جس طرح انسان میں تناسل کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس میں خوبصورتی، شگفتگی، ذہنی قوت، جسمانی طاقت، جولانی اور عملی سرگرمی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان غدوں کے فطری مقصد کو پورا نہ کیا جائیگا تو یہ اپنے ضمنی فعل یعنے تقویت کو بھی چھوڑ دیں گے خصوصاً عورت کو استقرار حمل سے روکنا دراصل اس کی پوری مشین کو معطل اور بے مقصد بنانا ہے۔"

ان مضرتوں کے علاوہ ایک بڑی مضرت یہ بھی ہے کہ ضبط ولادت کے طریقے استعمال کر کے جب استقرار حمل کی طرف سے بے فکری ہو جاتی ہے تو شہوانی جذبات قابو میں نہیں رہتے۔ عورت بہ مرد کے

شہوانی مطالبات، حد اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں، اور زوجین کے درمیان ایک خالص بہیمی تعلق باقی رہ جاتا ہے جس میں تمام تر شہوانی میلانات ہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ چیز صحت اور اخلاق دونوں کے لیے غایت درجہ نقصان دہ ہے۔ فورسٹر (Foerster) لکھتا ہے:-

"مرد کی زوجیت کا رخ اگر کلیۃً خواہشات نفس کی بندگی کی طرف پھر جائے اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی قوت ضابطہ نہ رہے تو اس سے جو حالت پیدا ہوگی وہ اپنی نجاست ودنائت اور زہریلے نتائج میں ہر اس نقصان سے کہیں زیادہ ہوگی جو بے حد وحساب بچے پیدا کرنے سے رونما ہو سکتی ہے۔

معاشرتی نقصان | عائلی زندگی میں ضبط ولادت کے جو مضر اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کی طرف اوپر ضمناً اشارہ کیا جا چکا ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات پر اس کا پہلا اور فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ جب دونوں کے داعیات فطرت کی تکمیل نہیں ہوتی تو ایک غیر محسوس طریقہ پر دونوں میں ایک طرح کی اجنبیت پیدا ہونے لگتی ہے، جو بعد میں مودت ورحمت کی کمی، سرد مہری اور آخر کار نفرت و بیزاری تک پہنچ جاتی ہے۔ خصوصاً عورت میں ان طریقوں کی مداومت سے جو عصبی ہیجان اور چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے وہ خانگی زندگی کی ساری مسرتوں کو غارت کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور بڑا نقصان بھی ہے۔ جو مادی اسباب سے زیادہ روحانی اسباب کی بدولت رونما ہوتا ہے جسمانی حیثیت سے عورت اور مرد کا تعلق محض ایک بہیمی تعلق ہے، جیسا جانوروں میں ہوتا ہے۔ مگر جو چیز اس تعلق کو ایک اعلی درجہ کا روحانی تعلق بناتی ہے، اور اس کو مودت ورحمت کے ایک گہرے رابطہ میں تبدیل کر دیتی ہے وہ اولاد کی تربیت میں دونوں کی شرکت اور اندر و باہمی ہے۔ ضبط ولادت اس مضبوط روحانی رابطہ کو وجود میں آنے سے روکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی گہرا اور مستحکم تعلق پیدا نہیں ہوتا، اور

ان کے تعلقات بہیمیت کے درجہ سے آگے نہیں بڑھنے پاتے بہیمیت کے تعلق میں ہر مرد و عورت کے لیے ہر مرد و عورت یکساں ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ایک جوڑہ ہمیشہ کے لیے ایک، دوسرے کا ہو کر رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں زوجی تعلقات نہایت ضعیف ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ضبط ولادت کی تحریک کے ساتھ ساتھ طلاق کا رواج اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ درحقیقت وہاں عائلی زندگی (Domestic life) کا سارا نظم درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے۔

اخلاقی نقصان اخلاق پر ضبط ولادت کے مضر اثرات متعدد وجوہ سے رونما ہوتے ہیں:۔

(۱)۔ عورت اور مرد کو زنا کا لائسنس مل جاتا ہے۔ حرامی اولاد کی پیدائش سے سیرت پر بدنامی و ذلت کا بدنما داغ لگ جانے کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا۔ اس لیے ناجائز تعلقات پیدا کرنے میں دونوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

۲۔ لذت پرستی اور بندگی نفس حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور اس سے ایک عام اخلاقی انحطاط وبائی مرض کی طرح پھیل جاتا ہے۔

(۳) جن زوجین کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، ان میں بہت سے وہ اخلاقی خصائص پیدا ہی نہیں ہوتے جو صرف تربیت اطفال ہی سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ماں باپ بچوں کی تربیت کرتے ہیں، اسی طرح بچے بھی ماں باپ کی تربیت کرتے ہیں۔ بچوں کی پرورش سے ماں باپ میں محبت، ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری کا سبق سیکھتے ہیں، سادہ معاشرت اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور محض اپنی ذاتی آسائش کے پیچھے اندھے نہیں ہو سکتے۔ ضبط ولادت ان تمام اخلاقی فوائد کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ توالد و تناسل کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنی صفت تخلیق و ربوبیت کا ایک حصہ انسان کو عطا کرتا ہے، اور اس طرح یہ انسان کے لیے متخلق باخلاق اللہ ہونے کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ ضبط ولادت پر عمل کرنے سے انسان اس بڑی نعمت کو کھو دیتا ہے۔

(۴) ضبط ولادت سے بچوں کی اخلاقی تربیت نامکمل رہ جاتی ہے جس بچے کو چھوٹے اور بڑے بھائی بہنوں کے ساتھ رہنے، سہنے، کھیلنے، کودنے اور معاملت کرنے کا موقع نہیں ملتا وہ بہت سے اعلیٰ اخلاقی خصائص سے محروم رہ جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت صرف ماں باپ ہی نہیں کرتے بلکہ وہ خود بھی ایک دوسرے کی تربیت کرتے ہیں۔ ان کا آپس میں رہنا ان کے اندر ملنساری، محبت، ایثار، اتحاد باہمی اور ایسے ہی بہت سے اوصاف پیدا کرتا ہے، اور وہ ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرکے خود ہی اپنے بہت سے اخلاقی عیوب کو دور کرلیتے ہیں۔ جو لوگ ضبط ولادت پر عمل کرکے اپنی اولاد کو صرف ایک بچے تک محدود کرلیتے ہیں، یا دو بچے اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ ان میں عمر کا بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے، وہ دراصل اپنی اولاد کو ایک بہتر اخلاقی تربیت سے محروم کردیتے ہیں۔

نسلی و قومی نقصانات | یہ تو وہ نقصانات تھے جو محض افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں اٹھانے پڑتے ہیں اب دیکھیے کہ اس تحریک کے رواج عام سے نسلوں اور قوموں کو بحیثیت مجموعی کس قدر شدید نقصان پہنچتا ہے۔

قحط الرجال | تخلیق انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو زبردست انتظام کیا ہے، اس میں خود انسان کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے جسم میں پہونچادے۔ اس کے بعد کوئی چیز انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اور اس کے ارادے پر منحصر ہے۔ ہر مرتبہ جب مرد عورت سے ملتا ہے تو مرد کے جسم سے کروروں جراثیم حیات عورت کے جسم میں داخل ہوتے ہیں، اور عورت کے جسم سے لاکھوں بیضی خلایا (Fgg-Cells) نکل کر ان جراثیم سے ملنے کے لیے بڑھتے ہیں۔ ان جراثیم اور ان خلایا میں سے ہر ایک جداگانہ نسلی اور شخصی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے انہی میں لیہا راو منفعلین بھی ہوتے ہیں، اور عقلاء و حکماء بھی۔ ان میں ارسطو اور ابن سینا بھی ہوتے ہیں، چنگیز اور نپولین بھی ہوتے ہیں، شکسپیر اور حافظ بھی ہوتے ہیں، میر جعفر اور میر صادق بھی ہوتے ہیں۔

یہ بات انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ کسی خصوصیت کے جرثومہ کو کسی ایک خصوصیت رکھنے والے بیضی خلیہ سے ملا کر اپنے انتخاب سے ایک خاص قسم کا انسان پیدا کر دے۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی کام کرتا ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس وقت کس قوم میں کس قسم کے آدمی بھیجے۔ انسان جو اپنے عمل کے نتائج سے بالکل بے خبر ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے اس انتظام میں دخل دیگا تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص اندھیرے میں لکڑی گھمائے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی لکڑی کسی سانپ یا بچھو کو مارے گی یا کسی انسان کا سر پھوڑے گی، یا کسی قیمتی شے کو توڑ پھینکے گی۔ بہت ممکن ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والا انسان اپنی قوم میں ایک بہترین جنرل یا مدبر یا حکیم کی پیدائش کو روک دینے کا سبب بن جائے، اور اپنی حد سے گذر کر اللہ تعالیٰ کے فعل میں دخل دینے کی سزا اس کو اس صورت میں ملے کہ اس کی نسل میں احمق یا بے ایمان اور غدار پیدا ہوں۔ خصوصاً جس قوم میں یہ مداخلت عام ہو جائے وہ تو بالیقین اپنے آپ کو قحط الرجال کے خطرے میں مبتلا کرتی ہے۔

شخصی اغراض پر قوم کی قربانی ضبط ولادت کی عام تحریک میں ہر شخص اپنے ذاتی حالات اور خواہشات وضروریات پر نظر رکھکر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کتنی اولاد پیدا کرے، بلکہ سرے سے پیدا کرے بھی یا نہیں۔ اس فیصلہ میں اس کے پیش نظر یہ سوال ہی نہیں ہوتا کہ قوم کو اپنی آبادی برقرار رکھنے کے لیے کم از کم کتنے بچوں کی ضرورت ہے۔ اشخاص نہ اس کا کوئی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، اور نہ شخصی ضروریات کے سامنے وہ قومی ضرورت کا لحاظ کرنے پر قادر ہیں۔ اس طرح اولاد کی پیدائش سراسر افراد قوم کی خودغرضی پر منحصر ہو جاتی ہے اور شرح پیدائش اس طور پر گھٹتی چلی جاتی ہے کہ اس کو کسی حد پر روکنا قوم کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اگر افراد میں خودغرضی بڑھتی رہے اور وہ خراب حالات جو ان کو ضبط ولادت پر ابھارتے ہیں خراب تر ہوتے رہیں تو یقیناً ایسے افراد اپنی اغراض پر قوم کی زندگی کو قربان کر دینگے حتی کہ ایک روز قوم کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

قومی خودکشی ضبط ولادت کی عام تحریک سے جس قوم کی آبادی گھٹنے لگتی ہے وہ ہر وقت تباہی کے سرے پر ہوتی ہے۔ اگر کوئی عام وبا پھیل جائے، یا کوئی بڑی جنگ چھڑ جائے جس میں کثرت سے آدمی مرنے لگیں، تو ایسی قوم میں دفعۃً آدمیوں کا کال رونما ہو جائے گا اور وہ کسی ذریعہ سے بھی اتنے آدمی فراہم نہ کر سکے گی جو مرنے والوں کی جگہ لے سکیں۔ یہی چیز اب سے دو ہزار سال پہلے یونان کو تباہ کر چکی ہے۔ یونانیوں میں اسقاط حمل اور قتل اولاد کا رواج پڑ گیا تھا جس سے آبادی گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ اسی زمانہ میں خانہ جنگیاں برپا ہوئیں جنھوں نے قوم کے بکثرت افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس دوہرے نقصان نے یونانی قوم کا ایسا زور توڑا کہ پھر وہ نہ سنبھل سکی اور آخرکار اپنے گھر میں دوسروں کی غلام بن کر رہی۔ ٹھیک ٹھیک اسی خطرہ میں مغربی ممالک اپنے آپ کو مبتلا کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا ہی یہ ہو کہ ان سے خودکشی کرائے۔ مگر ہم کیوں ان کی اندھی تقلید کر کے اپنی شامت کو اپنے ہاتھوں دعوت دیں؟

معاشی نقصان تجربہ اور تحقیق سے یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ ضبط ولادت معاشی حیثیت سے مفید ہے۔ اب معاشیات کے ماہرین میں یہ خیال روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے کہ آبادی کی تقلیل معاشی انحطاط (Economic depression) کے نہایت قوی اسباب میں سے ہے، اس لیے کہ شرح پیدائش کے گھٹنے سے پیداآور آبادی (Producing Population) کے مقابلہ میں خرچ کرنے والی آبادی (Consuming Population) کم ہو جاتی ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پیداآور آبادی میں بیکاری بڑھتی چلی جائے۔ پیداآور آبادی صرف جوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ برعکس اس کے خرچ کرنے والی آبادی میں بوڑھے، بچے، معذور بھی شامل ہوتے ہیں جن کا پیداآوری میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی تعداد گھٹ جائے تو مجموعی طور پر خرچ کرنے والوں میں بھی کمی واقع ہوگی۔ مال کے خریدار کم ہو جائیں گے۔

اسی نسبت سے مال طیار کرنے والوں کو کام کم ملے گا۔ اسی وجہ سے جرمنی اور اٹلی کے ماہرین معاشیات خاص طور پر توفیر آبادی کے لیے زور دیرہے ہیں۔

ضبط ولادت کے نقصانات کی یہ تفصیل جو سراسر حقائق پر مشتمل ہے، اس آیت پاک کی ایک جزئی تفسیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "وہ لوگ ٹوٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے ہلاک کر دیا اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو حرام کر لیا"۔ نیز اس سے اس آیت کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ۔

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲: ۲۵)

اور جب وہ پلٹا تو اس نے زمین میں فساد پھیلانے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرنے کی تدبیریں کیں۔

مباحث مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرث اور نسل کی بربادی کو فساد فی الارض سے کیوں تعبیر فرمایا ہے پھر اس بحث سے آپ اس آیت کا مفہوم بھی خوب سمجھ سکتے ہیں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا۔ (۱۷: ۴)

اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ان کو رزق دینے والے بھی ہم ہی ہیں، اور تم کو بھی انہیں قتل کرنا ایک بڑی خطا ہے۔

یہ آیت صاف تبلا رہی ہے کہ معاشی مشکلات کے خوف سے اولاد کی تعداد گھٹانا محض ایک حماقت ہے

اس کے بعد ہم کو ان دلائل سے بحث کرنی ہے جو ضبط ولادت کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں اسی ضمن میں ہم اُن احادیث کی صحیح تفسیر بھی بیان کریں گے جن سے ضبط ولادت کی موافقت میں استدلال کیا جاسکتا ہے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

گوشۂ برزخ

از جناب مولانا اسلم جیراجپوری

ماہ محرم کے ترجمان القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے میرے مضمون برزخ پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے اس میں سب سے پہلی غلط فہمی ان کو یہ ہوی ہے کہ انھوں نے اس کو معارف کے جواب میں خیال کیا۔ حالانکہ میں نے اس کے شروع ہی میں تصریح کردی ہے کہ میں دوبارہ مضمون برزخ کو کسیقدر وضاحت کے ساتھ لکھ رہا ہوں اور رسالۂ معارف کا انداز تحریر چونکہ ایذا نما تھا اس لیے اس کا جواب لکھنا پسند نہیں کرتا ہوں۔

مگر خیر ترجمان میں سید صاحب موصوف کا وہ لہجہ نہیں ہے جو معارف میں تھا۔ اس لیے میں ان کی تحریر کا جواب لکھتا ہوں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اب انھوں نے اس بحث کے دائرہ کو محدود کر کے صرف تین آیتوں میں رکھا ہے۔ لہذا میں ان میں سے ہر ایک کی توضیح قرآن کریم سے کیے دیتا ہوں مگر اس سے پہلے یہ اصول بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں جس میں مجھکو سید صاحب اور ان جیسے دیگر سلف پرستوں سے اختلاف ہے کہ قرآنی حقائق کو خالی الذہن ہو کر دیکھنا چاہیے کہ وہ جو کچھ ہوں اور جیسے ہوں ان کو مان لیں۔ خاص خیال لیے ہوئے قرآن میں گھسنا اور اس کی آیات کو توڑ کر اپنے خیال کے مطابق بنانا ناجائز بلکہ الحاد ہے۔ اور اس اصول پر میں قرآن کی نجتہ

دلیلیں رکھتا ہوں ۔

آیت اول | وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۔ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (۹۵)

اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمکو دیا تھا اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمھارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمھارے کاموں میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔ تمہارے باہمی تعلقات ٹوٹ گئے اور جو کچھ تمہارا گمان تھا وہ جاتا رہا

یہ پوری آیت اللہ تعالیٰ کا قول ہے جس کا ایک ایک لفظ قیامت کے دن سے متعلق ہے اور برزخ سے مطلقاً اس کا کوئی واسطہ نہیں ہیں اس کے اجزا تحلیل کر کے آیات سے ان کے ثبوت پیش کرتا ہوں ۔ اس میں تین باتیں کہی گئی ہیں ۔

۱۔ تم ہمارے پاس اس طرح اکیلے آگئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو بخشا تھا اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے ۔

۲۔ ہم تمہارے ساتھ تمہارے مزعومہ سفارشیوں کو نہیں دیکھتے ۔

۳۔ تمہارے اور تمہارے ان سفارشیوں کے درمیان جو خیالی تعلقات تھے وہ منقطع ہو گئے ۔

اب پہلے جزو کو لیجئے کہ تم ہمارے پاس اسی طرح اکیلے آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا یہ اللہ مجرموں سے قیامت کے دن فرمائیگا جیسا کہ دوسری آیت میں تصریح ہے ۔

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (کہف)

اور ہم ان کو حشر میں لائیں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ تیرے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے صف بستہ وہ ان سے کہیگا تم ہمارے پاس

اسی طرح آئے جس طرح ہم نے تمکو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس آیت کے نقل میں مجھ سے بے شک یہ سہو ہو گیا تھا کہ میں نے فرادیٰ کا لفظ لکھدیا تھا لیکن میرا استدلال اس لفظ پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ صرف یہ تھا کہ ان مجرموں کی آمد جن کا ذکر آیت ۹۵/۶ میں ہے اس کی نسبت اس میں تصریح کردی گئی ہے کہ قیامت کے دن ہو گی۔ اور محشر میں پیشی کے وقت اللہ ان سے فرمائے گا کہ تم ہمارے پاس اسی طرح آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔

آیت ۹۵/۶ میں اگرچہ قیامت کی تصریح نہیں ہے مگر اس میں پہلی بار کی پیدائش مثال میں پیش کی گئی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ گفتگو نشأۃ ثانیہ میں ہو گی جہاں ان سے کہا جائیگا کہ تم اکیلے آئے اور جو کچھ ہم نے تم کو بخشا تھا اس کو دنیا میں چھوڑ آئے۔

دوسرا جزو آیت کا یہ ہے کہ ہم تمہارے سفارشیوں کو تمہارے ساتھ نہیں دیکھتے جن کو تم ہمارا شریک گردانتے تھے۔

یہ سوال بھی مجرموں سے قیامت ہی کے دن ہوگا جس کی جابجا قرآن میں تصریح ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ انعام میں ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۲۱/۶	اور جس دن اللہ ان سب کو جمع کرے گا تو مشرکوں سے پوچھے گا کہ تمہارے وہ شرکاء کہاں ہیں۔ جن کا تم زعم رکھتے تھے۔

تیسرا جزو آیت کا یہ ہے "تمہارے اور ان سفارشیوں کے درمیان جو تعلقات تھے وہ منقطع ہو گئے"۔

یہ بھی حشر ہی کے دن اللہ ان سے کہے گا"

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۲۸/۱۰	اور جس دن ہم سب کو حشر میں لائیں گے پھر مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ ٹھیر جاؤ اور ان کے باہمی تعلقات کو ہم توڑ دینگے
إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۱۶۶/۲	جب کہ وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ہے دستبردار ہو جائیں گے ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی ہے اور عذاب دیکھ لیں گے اور انکے تعلقات باہمی منقطع ہو جائینگے

غرض یہ ہے کہ آیت ۹۵/۶ کا لفظ لفظ قیامت سے متعلق ہے اور اس کے کسی حرف کو بھی برزخ سے

کوئی تعلق نہیں مگر سید صاحب کو "فُرادیٰ" کے لفظ سے برزخ کا عذاب نظر آنے لگا۔ باوجود اس کے کہ وہ فرادیٰ کو "فرداً" کی جمع تسلیم کرتے ہیں پھر بھی دونوں کے استعمالوں میں فرق نکالتے ہیں۔ ان کے خیال میں "فرداً" کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص قیامت کے دن بلا مال و اولاد و اعوان و انصار کے آویگا۔ اور "فرادیٰ" کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ایک کرکے اکیلے اکیلے لوگ آئیں گے۔ اور یہ صورت صرف برزخ میں ہوسکتی ہے کیونکہ قیامت میں لوگ فوج در فوج آویں گے۔ اس ادبی اور لغوی تحقیق میں انھوں نے تین صفحے سیاہ کیے ہیں لیکن خود آیت کو غور سے دیکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی جس میں فرادیٰ کے مفہوم کی تشریح موجود ہے یعنی "لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی" کے آگے ہے "وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ" تم پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے (مال و اولاد و اعوان و انصار) جو ہم نے تم کو بخشے تھے۔ "وَتَرَكْتُمْ" پر واو وہی تفسیر کا واو ہے جس سے سید صاحب بہت گھبراتے ہیں۔ یعنی تمہارے اکیلے اکیلے آنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان چیزوں کو دنیا ہی میں چھوڑ آئے۔ اس لیے فرادیٰ کا مفہوم قرآن کی تصریح کے مطابق بعینہٖ وہی ہے جو "کلھم آتیہ یوم القیامۃ فرداً" میں اس کے مفرد فرداً کا مفہوم ہے۔

فرادیٰ کی یہ عجیب و غریب تحقیق لکھکر سید صاحب نے آیتہ کے مفہوم کو جو برزخ پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے یہ اسی قسم کی تاویل ہے جس کی نسبت ڈاکٹر اقبال کا قول ہے کہ ؎

آیات تو برحق ہیں مگر اپنے مفسر		تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

آخر میں انھوں نے اپنی اس تاویل کے متعلق خود بھی تذبذب کا اظہار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ولقد جئتمونا فرادیٰ سے جو خدا کا قول ہے قیامت کے واقعہ کا بیان ہے اور فرادیٰ کے معنی منفردین کے ہیں تاہم اوپر کی آیت ولو تری اذ الظٰلمون سے برزخ کے عذاب کا جو قطعی ثبوت ملتا ہے اس کا انکار العوم کی نام لو طائل سے نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اب ہم سید صاحب کی اس مزعومہ عذاب برزخ کی قطعی اثبوت آیت کا مفہوم بھی قرآن کریم سے دکھاتے ہیں۔

آیت دوم | وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلظَّٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ ٱلْمَوْتِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ ۹۴/۶

اور تو دیکھتا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکالو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے اور اس کی آیتوں سے اکڑتے تھے۔

اس آیت میں ان گنہگاروں کی سزا بیان کی گئی ہے جو گنہگاری کی حالت میں مرے ان کا گناہ یہ ہے کہ وہ مشرک ہیں۔ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور اس کی آیتوں پر ایمان لانے سے اپنے آپ کو بالا سمجھتے ہیں۔ ان کی سزا کا بھی ذکر ہے کہ وہ ذلت کا عذاب ہے۔

انھیں گنہگاروں کی سزا۔ اور یہی سزا۔ اور اسی جرم پر سزا قرآن کی دیگر آیات میں بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی الیوم بھی لکھا ہوا ہے جس سے سید صاحب برزخ نکالتے ہیں۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ عَلَى ٱلنَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَٰتِكُمْ فِى حَيَاتِكُمُ ٱلدُّنْيَا وَٱسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَفْسُقُونَ ۲۰/۴۶

اور جس دن کافر آگ پر پیش کئے جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذتیں تو اپنی دنیوی زندگی میں لے چکے اور ان سے مزے اٹھا چکے سو آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے تم زمین میں ناحق اکڑتے تھے اور نافرمانی کرتے تھے۔

اس لفظ سے کہ تم اپنی لذتیں اپنی دنیاوی زندگی میں لے چکے یہ صاف واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اخروی عذاب کا بیان ہے جہاں وہ لوگ آگ پر پیش کیے جائیں گے اور وہی ذلت کا عذاب اور وہی

ان کا جرم مذکور ہے۔ الیوم بھی وہی ہے۔ دوسری آیت میں اور بھی تصریح ہے۔

ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُخْزِیْهِمْ وَ یَقُوْلُ اَیْنَ	پھر اللہ ان کو قیامت کے دن رسوا کرے گا اور کہے گا
شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِیْهِمْ	کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکا جن کے بارے میں تم
قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْیَ	جھگڑتے تھے وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے کہیں گے کہ
الْیَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ الَّذِیْنَ	آج کے دن رسوائی اور برائی ان کافروں کے لیے ہے
تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۪	جن کی جانیں فرشتوں نے اس حالت میں قبض کی ہیں
	جب کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

اس آیت میں بھی انہی ظالموں کا ذکر ہے۔ وہی شرک اور کفران کا جرم ہے۔ وہی ذلت اور رسوائی ان کی سزا ہے۔ وہی الیوم ہے اور قیامت کی تصریح۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی تشریحات کے مطابق آیت ۹۳/۶ میں الیوم کا لفظ جو ان کی موت کے دن کے لیے مستعمل ہوا ہے بعینہ ان کی قیامت کا دن ہے۔ کیونکہ مردوں میں احساس زمانی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی موت اور قیامت کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔

بے شک موت کے وقت کفار پر سختی ہوتی ہے۔ متعدد آیات سے ثبوت ملتا ہے لیکن جان کنی کی حالت کا عذاب برزخ کا عذاب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ عالم برزخ تو موت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اسی واسطے آیت میں "ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ" فرمایا گیا۔ یعنی جان نکالتے وقت جو عذاب ہوتا ہے اس کے بعد پھر جو عذاب ہوگا وہ قیامت کے دن ہوگا۔

سید صاحب صرف ایک مفرد آیت کا مفہوم لے کر اس سے عذاب برزخ کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کوئی آیت اپنی تعلیم کے لحاظ سے اسی وقت قطعی الثبوت ہوتی ہے جبکہ اس کی تمام تفاصیل کو جو قرآن کے اندر ہیں دیکھ کر اس کا مفہوم متعین کیا جائے۔ کیونکہ قرآن کی اکثر

تعلیمات متعدد اور مختلف آیات میں پھیلی ہوی ہیں۔ ان سب کو ساتھ ملاکر دیکھنا ضروری ہے تاکہ ان میں باہم اختلاف نہ پڑسکے۔

آیت سوم | وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۲۴/۴۰)

آل فرعون کو برے عذاب آگ نے گھیر لیا جس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جائیں گے اور قیامت کے دن حکم دیا جائیگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کردو۔

اس آیت میں یعرضون کے معنے حال کے لیکر عذاب برزخ کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے یعنی وہ صبح اور شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں برزخ میں۔ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں ڈالے جائیں گے۔ یہ بھی وہی مفرد آیت کا مفہوم لیا گیا ہے۔ جو دیگر آیات کے خلاف پڑتا ہے۔ کیونکہ قرآن اہل برزخ کی حیات سے قطعاً انکاری ہے۔ وہ ان کے اندر زمانہ کا بھی احساس نہیں مانتا۔ وہ کسی قسم کے عذاب یا ثواب سے اثر پذیری کی صلاحیت ان میں نہیں تسلیم کرتا جیساکہ ہم نے نہایت مصرح طور پر حتمی دلایل سے ذی قعدہ ۵۳ھ کے ترجمان میں ثابت کردیا ہے۔ اس لیے اس آیت میں یعرضون کے معنے حال کے نہیں لیے جاسکتے ورنہ قرآنی تعلیمات میں اختلاف لازم آئے گا۔ جو ناممکن ہے بلکہ مستقبل کے لیے جائیں گے جس سے جملہ آیات کا مفہوم ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ اور یہی مفہوم دیگر قرآنی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کی پیشی آگ پر زمانہ مستقبل یعنے قیامت میں ہوگی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۲۰/۴۶)

اور جس دن کفار آگ پر پیش کیے جائینگے (ان سے کہا جائیگا کہ) تم (اپنی لذتیں اپنی دنیاوی زندگی میں لے چکے اور ان سے مزے اٹھا چکے۔

ظاہر ہے کہ کفار سے آل فرعون مستثنیٰ نہیں ہوسکتے جن کی پیشی بجائے مستقبل کے حال میں ہورہی ہو

بلکہ سورہ ہود میں تو خصوصیت کے ساتھ آل فرعون کے متعلق تصریح موجود ہے کہ وہ قیامت ہی کے دن آگ میں داخل ہوں گے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ (۱۱-۹۸) فرعون آگے آگے آئیگا اپنی قوم کے اور ان کو آگ میں اتاریگا قیامت کے دن۔

آل فرعون کے لیے سید صاحب نے جو دو عذاب سمجھے ہیں وہ غلط فہمی ہے اور افعل التفضیل سے جو نتیجہ نکالا ہے۔ اس میں دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آل فرعون بھی جملہ کفار کے ساتھ پیش کیے جائیں گے قیامت کے دن لیکن آل فرعون کو امام اہل نار ہونے کی وجہ سے

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ (۲۸) اور ہم نے آل فرعون کو پیشوا بنایا ہے کہ لوگوں کو جہنم کی دعوت دیتے رہیں۔

دیگر جہنمیوں سے زیادہ سخت عذاب میں داخل کیا جائیگا۔ جو ان کے سنگین جرم کے موافق ہوگا۔ اشد العذاب کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ برزخ میں ان کو جیسا ہلکا عذاب ملتا تھا۔ قیامت کے دن اس سے زیادہ سخت عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔

عرض کے معنی بھی محض پیشی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ وہ آگ میں ڈالدیے جائیں گے اس لیے غدواً و عشیاً کا مفہوم اہل لغت نے جو دوام کہا ہے تو بالکل قرآن کے مطابق کہا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ برزخ میں آل فرعون صبح اور شام آگ پر لے جا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے مستقر پر پہونچا دیے جاتے ہیں جس طرح چرواہے اپنے مویشیوں کو روزانہ صبح اور شام پانی پر لے جاتے ہیں اور واپس لاتے ہیں قرآن فہمی نہیں ہے۔ اب رہا عطف تفسیر کا مسئلہ۔ تو اس کا میں قائل ہوں۔ کیونکہ قرآن آیات میں اس قسم کے واؤ مجھے ملتے ہیں۔ مثلاً۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ اور جب فرمایا اللہ نے کہ اے عیسیٰ میں تجھکو وفات دونگا

وَرَافِعُكَ اِلَیَّ (۵۵ ۳) یعنے اپنے پاس اٹھا لونگا۔

یہاں واو تفسیری ہے اور تبلاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے معنی رفع الی اللہ کے ہیں۔ چنانچہ دوسری آیت میں جہاں ان کی وفات کا ذکر آیا ہے تو وہاں توفی کا لفظ نہیں بولا گیا بلکہ اس کی تفسیر ہی ذکر کی گئی۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۴ ۱۵۸ اور انھوں نے عیسیٰ کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔

اسی طرح قرآن میں بہت سے مواقع ہیں جہاں واو تفسیری لینے سے آیات کے مطالب حل ہو جاتے ہیں۔ اور دنیا میں کونسی زبان ہے جس میں واو تفسیری نہیں ہے مثلاً۔

اس نے انکار کیا ور کہا کہ میں نہیں آؤنگا

اس نے انکار کیا یعنے کہا کہ میں نہیں آونگا۔

آپ مجھسے قرآن سے دلیل طلب کر سکتے ہیں لیکن قطرب اور اخفش یا فراء اور کسائی کا میں غلام نہیں ہوں کہ ان اوہام وقیاسات سے آگے نہ بڑھوں۔

اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ۔ کیا تم مجھسے ان ناموں میں جھگڑتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے رکھ چھوڑا ہے۔

آپ کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ اس عطف تفسیر پر آپ کے اعتراض کی وجہ سے میں نے کتاب کے صفحے بدلے کیونکہ اس میں کئی جگہ واو اب بھی اسی معنے میں مستعمل ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ بعض ایسے فقرے متن میں آگئے تھے جو میرے اصول کے مطابق حاشیہ میں ہونے چاہیے تھے۔

آخر میں عرض کرتا ہوں کہ برزخ کے عذاب یا ثواب کا عقیدہ قرآن کریم سے پیدا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کی بنیاد یہ حدیث ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ یَھُوْدِیَّۃً دَخَلَتْ عَلَیْھَا فَذَکَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَھَا اَعَاذَکِ اللّٰہُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَأَلَتْ عَائِشَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ۔ قَالَتْ عَائِشَۃُ فَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰی صَلٰوۃً اِلَّا تَعَوَّذَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب عذاب القبر)	حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک روز ایک یہودن ان کے پاس آئی اس نے عذاب قبر کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ اللہ تم کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کے بابت دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں عذاب قبر برحق ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز پڑھی ہو اور عذاب قبر سے پناہ نہ مانگی ہو۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرور انبیاء اور خاتم الرسل جن کا سینہ علم لدنی کے لیے کھولدیا گیا تھا اس وقت تک عذاب قبر سے خالی الذہن تھے یہانتک کہ اپنے اہل بیت کو بھی اس کے متعلق کوئی تعلیم نہیں دیتے تھے جبتک کہ ایک یہودن نے آپ کے گھر میں آکر عذاب قبر کا ذکر نہ کیا جس کے بعد سے آپ ہر نماز میں اس سے پناہ مانگنے لگے۔ یہی عقیدہ ہے جس کی بنیاد پر علماء اسلام لگے مردوں میں روحانی زندگی ثابت کرنے جن کو قرآن کریم نے اموات غیر احیاء کہکر ایک شمہ بھی حیات کا ان کے ساتھ لگا رہنے نہیں دیا تھا۔ عوام نے مردوں کو زندہ سمجھکر استمداد شروع کی۔ اور عرش بریں کے زندہ رب کے سوا زیر زمین شرکاء اور شفعاء کی ایک آباد دنیا ان کو نظر آنے لگی۔ بالائے زمین سے علیک علیک اور خاطر مدارات ہونے لگی اور وہ شرک مسلمانوں میں پھیلا کہ جس سے نہ ایشیا محفوظ رہا نہ افریقہ۔ شرک بت پوجتے ہیں مسلمان مٹی کے ڈھیر۔

مطبوعات

قادیانی مذہب | یہ جناب محمد الیاس برنی صاحب ایم اے ال ال بی ناظم دارالترجمۂ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی کتاب "قادیانی مذہب" کا تیسرا ایڈیشن ہے، جو مزید مضامین کے اضافہ کے ساتھ ۶۰۰ صفحات تک پہنچ گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اس میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کے خلفاء اور خواص متبعین کی تحریروں کے اقتباسات جمع کرکے اس قابلیت کے ساتھ ان کو مرتب کیا ہے کہ ایک نظر میں مرزا صاحب کی شخصیت، ان کی سیرت ان کے اخلاق و معاملات، ان کے عقائد اور ان کے مذہب کی ابتدا و انتہا، غرض سب کچھ انسان کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کو دیکھ کر ایک صحیح الفکر آدمی خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مرزا صاحب اپنے دعوائے نبوت میں کس حد تک صادق ہو سکتے ہیں۔ اور ان کا مذہب کہاں تک اس قابل ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔ مرزا صاحب اور ان کے مذہب کے اساطین کی جتنی تحریریں نقل کی گئی ہیں۔ وہ سب ان کی اپنی کتابوں سے منقول ہیں، اور ہر اقتباس کا پورا پورا حوالہ درج کیا گیا ہے۔ ان تحریروں کو دیکھنے سے کم از کم ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرزا صاحب کو نبی ماننا تو درکنار، ایک متقی، اور نیک نیت انسان سمجھنا بھی مشکل ہے، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے آنکھیں دیکھنے اور عقل سمجھنے کے لیے دی ہے، وہ کیونکر اس کیرکٹر اور ان خیالات کے آدمی کو اللہ کا رسول تسلیم کر سکتے ہیں۔

محرم کے ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے کہ اسلام میں سلسلۂ نبوت کے جاری ہونے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اسلام کے لیے اس سے زیادہ خطرناک

کوئی فتنہ نہیں ہوسکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص آئے اور کہے کہ مسلمان ہونے کے لیے محمد اور قرآن پر ایمان لانا کافی نہیں بلکہ جو شخص مجھ پر ایمان نہ لائے وہ محمد اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود کافر ہے اس قسم کا دعویٰ کرنے والا صریح نصوص قرآنی کا منکر ہے ضروریات دین میں سے ایک اہم ضرورت کو ساقط کرتا ہے اسلام کی عین بنیاد پر ضرب لگاتا ہے اور تمام دشمنان اسلام سے بڑھ کر اسلام اور اسلامی جمعیت و وحدت کا دشمن ہے پس کسی مسلمان کے لیے تو یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کی نبوت پر ایمان لائے خواہ وہ مدعی نبوت کیسا ہی متقی اور نیک اور صاحب کمالات ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اسلام سے باہر ہو کر کسی شخص کی نبوت پر ایمان لانے کے لیے مستعد ہو تو بہرحال یہ تو دیکھنا ازروئے عقل اس کا فرض ہے کہ جو شخص اس کے سامنے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس کے اخلاق اور اعمال اور اقوال اس کے دعوے کی کس حد تک تائید کرتے ہیں۔ مرزا صاحب اور ان کے مذہب کے اساطین کی تحریریں ان کی جو تصویر پیش کرتی ہیں، افسوس کہ وہ اس غیر اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس لائق نہیں کہ کوئی آنکھوں والا اس کا گرویدہ ہو۔

اس مرتبہ چونکہ کتاب بہت ضخیم ہوگئی ہے۔ اس لیے جناب مولف نے اس کی قیمت مقرر کردی ہے لیکن وہ صرف دو روپیہ ہے، جو شاید اصل لاگت سے زیادہ نہیں۔

نگارستان کشمیر | تالیف قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی ضخامت ۱۰۴ صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ: مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی، مکتبۂ شرقیہ۔ دہلی۔

سیاحت کشمیر کے موقع پر قاضی صاحب نے کشمیر کی وہ تاریخیں دیکھیں جو بعض ہندو مصنفین نے لکھی ہیں۔ ان میں مسلمان فرمانرواؤں اور عام مسلمانوں، اور ان کے ساتھ خود اسلام پر جیسے رکیک حملے کیے گئے ہیں، ان کو دیکھ کر قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ کشمیر کے صحیح اور مستند حالات جمع کرکے ایک کتاب کی صورت میں پیش کریں۔ نگارستان کشمیر اسی خیال کی عملی تعبیر ہے۔ اس کتاب میں ہندوؤں کے

دورِ حکومت کی تاریخ خود ہندو مورخین کی کتابوں سے اخذ کرکے لکھی گئی ہے۔ اور مسلمان فرمانرواؤں کے حالات عمدہ تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ان حملوں کی بھی تردید کی گئی ہے جو کشمیر کے ہندو مصنفین نے مسلمان فرمانرواؤں اور اسلام پر کیے ہیں۔ کتاب فی الجملہ محققانہ انداز میں لکھی گئی ہے لیکن کہیں کہیں غیر متعلق مباحث میں اطناب سے بھی کام لیا گیا ہے۔

ضروری کہانیاں | مولفہ قاضی عبدالصمد صاحب سیوہاروی قیمت ۶/ ملنے کا پتہ۔ مولوی محمد ادریس میرٹھی، مکتبہ مشرقیہ دہلی۔

اس مختصر رسالہ میں مولف نے تاریخ ہند کے ہندو اور مسلمان مشاہیر کے سبق آموز واقعات کہانی کے انداز میں لکھے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان بچے دونوں قوموں کے اکابر سے اس طور پر روشناس ہوں کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کے بجائے ایک دوسرے کے لیے احترام کے جذبات پیدا ہوں۔

سودیشی اردو | مولفہ قاضی عبدالصمد صاحب سیوہاروی۔ قیمت ۴/ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس میرٹھی مکتبہ مشرقیہ۔ دہلی۔

یہ ۳۲ صفحہ کا رسالہ ہے جس میں مولف نے چند مختصر مضامین خالص سودیشی اردو میں لکھے ہیں۔ حمد سے لیکر تمت تک پورے رسالہ میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ نہیں آیا ہے۔ اس قسم کی اردو کا ایک نمونہ سید انشا نے لکھا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک شاید کسی نے ایسی خالص اردو نہیں لکھی۔

عصر جدید | تالیف جناب جانکی پرشاد صاحب۔ ضخامت ۱۰۵ صفحات مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد

اس مختصر کتاب میں مولف نے اعلیحضرت میر عثمان علیخاں بہادر فرمانروائے دولت آصفیہ کے عہدِ حکومت کی تاریخ اور علوم و فنون کی ترقی، رفاہ عام کے کارناموں اور انتظامی اصلاحات کے متعلق مفید معلومات جمع کردی ہیں۔ غیر ضروری تفصیل و اطناب کو چھوڑ کر ہر شعبۂ ریاست کی ترقیات و اصلاحات کے

متعلق صرف کام کا مواد اخذ کیا ہے اور اس کو اچھے سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ زبان ستھری اور انداز بیان واضح ہے مؤلف کتاب دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے ایک لائق کارکن ہیں اور یہ بات اس علمی محکمہ کے لیے موجب امتیاز ہے کہ اس کے اہل دفتر میں بھی تصنیف و تالیف کا ذوق پایا جاتا ہے۔ کتاب کی زبان اور حسن ترتیب اور اسلوب بیان کو دیکھ کر یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا لکھنے والا ایک دفتر میں محض کارکن ہوگا۔

انوار آصفیہ] تالیف جناب مولوی منظر علی صاحب اشہر صاحب منظر الکرام ضخامت ۴۰۳ صفحات۔ مؤلف سے نظام دار النشر کلب خیرت آباد دکن کے پتے پر مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم و مغفور اور اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر کے ان فرامین کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔ جو ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۴۹ھ تک عطائے جاگیرات و مناصب کے متعلق نافذ ہوتے رہے ہیں مؤلف نے یہ مجموعہ برسوں کی محنت سے تیار کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ فرامین بڑی تلاش و تجسس سے اخذ کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اس کا فائدہ حیدرآباد کے جاگیرداروں اور اہل مناصب کے لیے ہے کیونکہ ان دونوں جلیل القدر فرمانرواؤں نے اپنے فرامین میں جگہ جگہ عطائے جاگیرات و مناصب کے متعلق ریاست کی پالیسی اور اس کے اصول کی تشریح کی ہے جس سے آیندہ مواقع پر نظائر کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن ایک عام مطالعہ کرنے والے کے لیے بھی اس کتاب میں دلچسپی کا کافی سامان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی بہت سی بڑی بڑی ریاستیں مثلاً جے پور، اودے پور، جودھپور، اورچھا اور بیکانیر وغیرہ اس وقت تک سلطنت آصفیہ کی جاگیردار ہیں ریاست اندور کا فرمانروا اس سلطنت کا ایک پٹیل ہے۔ نیز اس کتاب میں آپ کو شاہان آصفی کی فیاضی رواداری اور عالی حوصلگی کے بہت سے نمونے ملیں گے۔ مثلاً اکبر بادشاہ کی سند دکھانے پر ایک شخص کو جاگیر دی جاتی ہے۔ جاگیرداروں کے جانشینوں پر جاگیریں بحال کرتے وقت بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ دوسرے شرعی وارثوں کے حقوق ادا کریں۔ گرد داروں، مٹھوں، دیولوں اور دوسرے غیر مسلم معابد کے خدام کی معاشیں بحال کرتے وقت ان پر شرط عاید کی جاتی ہے کہ اپنی

مذہبی خدمات پابندی کے ساتھ ادا کریں گے بیوہ عورتوں کے نام ان کے شوہروں کے گذارے جاری کرنے کے تحت تا نکاح ثانی کی جو قید لگائی جاتی تھی اس کو صرف اس خیال سے حذف کیا جاتا ہے کہ مبادا گذارا بند ہونیکا خوف عورتوں کو نکاح سے روک کر حرام کاری میں مبتلا کرے۔

مجموعہ صرف و نحو اردو مؤلفہ قاضی ڈاکٹر خلیق احمد صاحب صدیقی صدر خطیب و مفتی ریاست جوناگڈھ ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ۹ ر مولف سے کنگ روڈ۔ جوناگڈھ (کاٹھیاوار) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں زبان اردو کے قواعد سہل طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں اور حتی الامکان غیر مانوس اصطلاحات کو چھوڑ کر صرف وہی اصطلاحات استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اردو میں مستعمل ہو چکی ہیں۔ یا جن کا استعمال ناگزیر ہے۔

مسلم ریویو کا خاص نمبر لکھنؤ کے اس انگریزی رسالہ پر اس سے پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ زیر نظر پرچہ اس کا خاص نمبر ہے جس میں نومبر اور دسمبر کے پرچے ملے ہوئے ہیں۔ تمام تر مضامین قرآن مجید، سیرت نبوی اور مختلف اسلامی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد شیلڈ ریک کا مضمون "طلوع سحر" ڈاکٹر زکی الدین کا مضمون "سائنس میں اسلام کا حصہ"، ڈاکٹر شاہ نواز خاں کا مضمون "اسلام اور جدید سائنس"، ڈاکٹر حسین کا مضمون "پیغمبر (علیہ السلام) کا کام اور پیغام" خاص طور پر قابل دید ہیں۔ ڈاکٹر شیلڈ ریک نے اسپین کے مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن خاندانوں کو اسپین کی ظالم حکومت نے جبراً عیسائی بنالیا تھا وہ صدیوں تک ظاہر میں عیسائی بنے رہے اور کلیسا میں جا کر عبادت کرتے رہے، مگر ان کے دلوں میں اسلام نے ایسا گھر کیا تھا کہ کسی کے نکالے نہ نکلا۔ یہ راز اس وقت کھلا جب اسپین کی بادشاہی کا خاتمہ ہوا اور نئی جمہوریت نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اعلان آزادی کے بعد بہت سے مسلمان خاندانوں نے اپنے پوشیدہ اسلام کا اظہار کر دیا اور مسجد میں جا کر نماز ادا کی۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور اسلام کا زندہ معجزہ۔

مکتبۂ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور انکے تراجم مل سکتے ہیں طلبا کیلیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد میں اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور و نامور شعرا اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر فہرست طلب ——— مالک خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبہ علمیہ چارمینار حیدرآباد دکن ——— فرمایئے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام اڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن اڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)